Registered No. L. 4186.

شوال ۱۳۵۸ھ

جلد ۱۵ — عدد ۴

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" ۔ لاہور

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ

قیمت سالانہ عہ

قیمت فی پرچہ ۵ر

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے -

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے -

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات -

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب' بودھ مت' یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ-

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵ر غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے- اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں-

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے-

قیمت ۱۰ ار محصولڈاک ۲ر خرچ وی پی ۳ر

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

سرورق و تصاویر برن پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوئے

فہرست مضامین

ماہ شوال ۵۸ھ (دسمبر ۳۹ء) - جلد ۱۵ - عدد ۴

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ

لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ

مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں، کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتلائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے اس وقت پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

"یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمان برے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ .... کیا جس وقت تک سب راہِ راست پر نہ آجائیں اُس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ انکی بہتری کے واسطے انہیں جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟ .. .. ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اسکی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اسکی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:-

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہتیرے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی

ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرز عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جنکے رویہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائیگی۔ مگر اب آپنے اُن دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں۔ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہرحال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپکا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکے گا کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے فی الحال بری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اسکا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا ساتھ بھی آپ دینا نہیں چاہتے۔"

مشتے نمونہ از خروارے۔ یہ من جملہ ان بہت سے شکایتی اور احتجاجی خطوط کے ہیں جو کچھ مدت سے میرے پاس آ رہے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی کے طرز خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اگر محض چند افراد کے یہ خیالات ہوتے تو انکو یہاں نقل کر کے برسر عام جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جبکہ ایک گروہ کثیر اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہے، تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کھل کر کچھ صاف صاف باتیں کہہ دی جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ احتساب نفس، اپنے اوپر آپ تنقید کرنا، اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے

جیسے حلق سے اتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اسکے اندر پاتے ہونگے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقع میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ انکے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اسکی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشے میں مریض سو تو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جنکے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی اُنہیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ انکی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ حیوان پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں، بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جنکے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گروہ میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اسکی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے، جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی اُلجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے اور تم اسکی مخالفت کرتے ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے، دوسرے کے نزدیک اُن پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہوگا جس کو فی نفسہٖ فلاح مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آیئے، ذرا تحقیق کرکے دیکھیں کہ اس اُلجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مقیّد کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اسکے استعمال میں وسعت ہوتی ہے، اور جب اسے کسی قید کے ساتھ مقیّد کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم رنگ بولتے ہیں تو اسکا استعمال ہر رنگ پر ہوگا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں یا سرخی میں، بہرحال ہم کہینگے کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سرخ، سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکینگے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ"

کو لیجیے - ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے، جس طرف بھی وہ بڑھے، اس کی پیش قدمی کو پیش قدمی کہا جا سکتا ہے - ہر شخص اسکا میر قافلہ بن سکتا ہے، ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے، ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے، غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی - لیکن جب عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اسی قافلہ پر ہوگا جو عازم پشاور ہو - یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور - اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائیگی - مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے - اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائیگا، کیونکہ دوسرے راستے پر جتنے قدم وہ چلے گا پشاور کی نسبت سے دور ہوتا چلا جائیگا - اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو - دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا - اسی پر دوسرے تمام امور کو بھی قیاس کر لیجیے -

---

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے - قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے - ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور" - مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں - یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے - یا آپکا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رخ پر چاہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے قافلۂ پشاور ہی - بخلاف اسکے میں قافلۂ پشاور کو اسکے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز

کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلہ کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے انکی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زاد راہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، انکو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارنے لگتے ہیں کہ چل پڑا پشاوری قافلہ۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلۂ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورت قافلیہ تو بن رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیہ بن جانے کا نام تو "قافلۂ پشاور" بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میر کارواں کتنا لائق، منتظم اور مدبر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ سہی مگر پشاور کا راستہ بھی جانتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اسکا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلۂ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں تو اسکی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اسکی منزل مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی کبھی لے ہی لینگے

میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک عزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں اسوقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپکی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گذار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہٰذا سردست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپکو دشوار گذار راستہ کی طرف گھسیٹنے پر کب اصرار کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرما دیں۔

اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مقید کو مطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مقید کو مقید ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کر لیں، اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلہ بقید پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اسکی تنظیم اور اسکی پیش قدمی کے مخالف ہو حالانکہ نفس اجتماع و تنظیم اور نفسِ پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا۔ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ قافلہ اگر قافلۂ پشاور نہیں تو اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اُس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرلے، بہرحال قافلۂ پشاور کا نام اس پر راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ جا رہا ہے وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپکو پہلے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں

حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے - مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازم پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلاف واقعہ بات باور کرانا آخر ہمدردی کی کونسی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں - جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لینگے - اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں، میں نہ تو انکا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کروں - میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں، سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں -

---

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آ رہی ہے اسکی نوعیت بعینہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے - مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریق فکر، ایک مقصد زندگی، ایک کیرکٹر، اور طرز عمل کا نام ہے - اس لحاظ سے مسلمان صرف اُس کو کہا جائیگا جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصد اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے - لفظ "مسلمان" کے ان تقیدات کو صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، اُن کی تنظیم، انکی ترقی و خوشحالی، انکی قیادت و امارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم معین ہو جائیگا - لیکن اگر ان تقیدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے،

جس چیز کو چاہے انکی فلاح وبہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے انکی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا نظر آئے اسے مسلمانوں کا قائدِ ملت اور امیر مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورت حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کر کے فی الواقع "مسلمانوں" کو محض ایک گروہِ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، انکی فلاح وبہبود، انکی تنظیم وجمعیت، انکی قیادت وامارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اسکی رو سے مسلمان مامور ہیں اِس پر کہ اُس پورے نظام مالیات کو توڑ ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ الجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپکی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اسکا نام "مسلمان کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور آئین ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمانوں کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقیّد کر کے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظام حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظام تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح وبہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کا نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے

ہیں، حالانکہ یہ پورا نظام تعلیم انسانیت کی تشکیل اُس نقشہ پر کرتا ہے جس کے بالکل برعکس نقشہ پر اسلام اسکی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیتِ سیاسی، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے؛ تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اسوقت برسرکار ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت صرف وہ ہوسکتی ہے جو سیاست و حکمرانی کے اسلامی اصولوں کو لے کر اٹھے اور انہی کو فرماں روا بنانے کے لیے جدو جہد کرے۔ جو لیگ یہ کام نہیں کرتی وہ مسلم لیگ تو نہیں ہے، اور جو نام آپ چاہیں اسکے لیے تجویز کرلیں۔ اسلام اگر کسی تحریک کا نام ہے تو اس کا قائد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو اس تحریک کو جانتا اور سمجھتا ہو اور جو عملاً اس پر کاربند ہو۔ یہ صفت اگر اس میں نہیں ہے تو وہ دوسری حیثیت سے کیسا ہی لائق اور فرزانہ ہو، بہرحال اسلامی تحریک کا قائد نہیں ہوسکتا۔ مگر آپ کا قائدِ ملت! اور آپ کا امیرِ لشکر! پہلے صاحب کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ اسلام کی الف بے تک سے ناواقف ہیں۔ رہے دوسرے صاحب تو ان کے فضل و کمال کا منتہیٰ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں تک کو مسخ کر ڈالا ہے اور ایک نئی چیز بنا کر اسلام کے نام سے کھڑی کردی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود جب آپ کہتے کہ مسلم لیگ اور خاکسار تحریک، بس یہ دو ہی تو مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام کررہی ہیں اور تو کم بخت ان سے بھی اختلاف کرتا ہے، مسٹر جناح اور علامہ مشرقی، بس یہ دو ہی تو ملت کے ناخدا ہیں، اور تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت نہیں کرتا، تو میں بجز اس کے کہ آپ کے دماغ کی الجھن اور نظر کی پراگندگی

پر افسوس کروں اور کیا کر سکتا ہوں۔ آپ اسلام کے معنی اور مسلمان کے مفہوم سے واقف ہوتے تو یہ بہکی ہوئی باتیں کیوں کرتے!

ہاں یہ سچ ہے کہ ڈوبنے والوں کو بچانا انسان کا فرض ہے۔ میں بھی اس کو انسانیت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ انہیں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے۔ مگر میں اس کو کیا کروں کہ ڈوبنے اور تیرنے کا مفہوم میرے اور ان کے درمیان متضاد ہے۔ جسے میں ڈوبنا سمجھتا ہوں اسے وہ تیرنا کہتے ہیں۔ جسے میں تیرنا کہتا ہوں اسے وہ ڈوبنا سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تیرنا یہ ہے کہ آدمی اپنی جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دے، اللہ کے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دے، اور دنیا بھر سے اسی ایک معاملہ پر لڑنے کے لیے کھڑا ہو جائے خواہ اس لڑائی میں جان چلی جائے یا گھر بار تباہ ہو، یا دنیوی لحاظ سے زندگی برباد ہو جائے۔ ٹھیک اسی چیز کا نام انکی لغت میں ڈوبنا ہے، اور اسکے برعکس وہ تیرنا اسکو سمجھتے ہیں کہ یا تو وہ خود ارباب من دون اللہ بن جائیں یا اگر یہ نہ ہو سکے تو دوسرے ارباب کی ربوبیت میں انکو پھلنے پھولنے کا موقع مل جائے۔ اب فرمائیے کہ میں انکے ساتھ ہمدردی کس طرح کروں؟ کیا ہمدردی کے معنی یہ ہیں کہ جسے وہ تیرنا سمجھتے ہیں، اسے اپنے ضمیر اور اپنے علم کے خلاف خود بھی تیرنے سے تعبیر کرنے لگوں؟ یا ہمدردی اسکا نام ہے کہ جسے میں ڈوبنا سمجھتا ہوں اس میں جانتے بوجھتے انکے ساتھ خود بھی غرق ہونے کو تیار ہو جاؤں؟ اگر ہمدردی کا مفہوم آپکے ذہن میں یہی ہے تو معاف کیجیے، میں اس قسم کی ہمدردی کسی کے ساتھ، حتیٰ کہ خود اپنی اولاد کے ساتھ بھی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ایسی ہمدردی نوح نے اپنے بیٹے کے ساتھ، ابراہیم نے اپنے باپ کے ساتھ اور محمد عربی نے اپنے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا تھا، علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ میں انہی کے ساتھ اپنا حشر چاہتا ہوں لہٰذا میں بھی اس سے انکار کرتا ہوں۔ میرے

نزدیک ہمدردی صرف یہ ہے کہ جسے میں علیٰ وجہ البصیرت نجات اور فلاح کا راستہ سمجھتا ہوں اسکی طرف ہر انسان کو دعوت دوں۔ اگر اسکی طرف کوئی آئے اور اسی پر جینے اور مرنے کو تیار ہو تو میرے سر اور آنکھوں پر۔ اور اگر کوئی اس طرف نہیں آتا تو اسے پکڑنے کے لیے میں اپنے راستہ سے نہیں ہٹ سکتا۔ جن راہوں میں وہ بھٹکنا چاہتا ہے، بھٹکے اور جن جن بھٹکنے والوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے چلے۔

میرے بعض دوست کہتے ہیں کہ تو محض ایک خیالی آدمی ہے، اور عملی سیاست سے بالکل بے بہرہ ہے۔ دیکھو تو سہی کہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں، اور اکثریت ان پر غالب ہے، پھر بھلا اس حالت میں اسلام کی حکومت کا نام کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ یہاں تو اصلی سوال صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادیت کس طرح برقرار رہے اور جو بھی حکومت ملک میں قائم ہو اس میں مسلمان حصہ دار کیسے بنیں۔

عملی سیاست کا یہ درس سن کر مجھے ہنسی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ یہاں پھر میرے اور انکے درمیان مسلمان کے مفہوم کا وہی اختلاف حائل ہو جاتا ہے۔ مسلمان کا جو مفہوم انکے ذہن میں ہے، اور اسکی نجات کے لیے جو تدبیریں وہ سوچ رہے ہیں انکے لحاظ سے تو میرے نزدیک ہندوستان میں مسلمان کے مستقبل پر مہر لگ چکی ہے۔ اسکی انفرادیت ۸۰ فی صدی گم ہو چکی ہے، اور ۲۰ فی صدی جو باقی ہے اسکو بھی محو ہونے سے بچایا نہیں جاسکتا، صرف تاخیر میں ڈالا جاسکتا ہے۔ بخلاف اسکے جو مفہوم مسلمان کا میرے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے ایک مسلمان بھی اسلام کی حکومت کا نام لینے کے لیے کافی ہے۔ ایک تن واحد بھی اگر اسلام کی روح اپنے باطن میں اور اس روح کا عملی ظہور اپنے ظاہر میں رکھتا ہے، تو اس کے اندر یہ طاقت موجود ہے کہ اسلام کی حکومت قائم کر دے، عملاً اسکی کامیابی کا امکان ہے، اور عالم واقعہ میں ایسا ہو چکا ہے۔ میں اسکی کامیابی کو نہیں بلکہ اسکی ناکامی کو مستبعد سمجھتا ہوں۔

مقالات

اسلام کا نظریۂ سیاسی

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ "یہ ایک جمہوری نظام ہے"۔ پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے۔ مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے شائد ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر جمہوریت کا نام اس پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور اکثر ایسے ہیں جنکی ذہنیت ہی کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو، اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اُس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اِسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی با اثر شخص کی سرپرستی اُس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹرشپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر، اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ دیکھو، یہاں سارا نظام جماعت ڈکٹیٹرشپ ہی پر قائم ہے"

غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستاں، ایک چوں چوں کا مربہ بنکر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھادی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائیگا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ " اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا"، بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائیگی جسکی وہ سخت حاجتمند ہے، اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیجیے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف قسم کی چیزیں لاکر جمع کردی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جسکی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اُس کے بڑے بڑے ارکان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اُس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اُس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اسکے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ اِن اصول اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں، اور خوب پھیل جانے کے باوجود اسکی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کیلئے ناگزیر ہے کہ اسکی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اسکی روح کو نہیں پاسکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا

مشن ہے - یہ صرف محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا - اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب بنی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں - سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے - تجسس کی نگاہ ڈالکر اچھی طرح دیکھیے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا، اور صرف اسی کی عبادت کرانیکا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الٰہٍ غیرہ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بنکر اسکو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آجکل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری و اطاعت میں لگ جاؤ، تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لیے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟ آئیے، ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کی بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق، اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں:

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ - قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ - قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ؟ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ	ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہینگے کہ اللہ کا ہے۔ کہو، پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ کہینگے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جسکے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اسکے مقابلہ

إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ؟ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۔ قُلْ
فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ؟ (المومنون ۔ ۵)

میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ
کہینگے اللہ ۔ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیے گئے ہو؟

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ؟ لَيَقُولُنَّ
اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ؟ . . . وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن
نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ
مِن بَعْدِ مَوْتِهَا؟ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (العنکبوت ۔ ۶)

اگر تم اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟
اور کس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور
کہینگے کہ خدا نے ۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟ . . . اور اگر
تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین
کو روئیدگی بخش دی؟ وہ ضرور کہینگے کہ اللہ نے ۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ؟ لَيَقُولُنَّ
اللَّهُ ۔ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ؟ (الزخرف ۔ ۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہینگے
کہ اللہ نے ۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں ۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں، اور اسکے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا ۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے، لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لیے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں ۔ اب پوچھیے کہ انبیاء کی آمد کس لیے تھی، اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے ۔ اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو ۔ مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی ۔ آیئے، ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دنیا کیوں اس پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں ۔ مگر معاف کیجیے گا، معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں ۔ معبود کا مادّہ عبد ہے ۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں ۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے

نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی وجہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اُسے پیش کر دینا، اس کی طاقت وجبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اسکی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اسکا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جسکی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

اور رب کا مفہوم کیا ہے؟ عربی میں ربّ کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت وفرمانبرداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال، اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جسکو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جسکی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائیگی، جسکو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جسکی فرمانبرداری واطاعت کرے، وہی اسکا ربّ ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے۔ انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی وعبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لیکر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی۔ انسان ہی کی حد سے

بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار، یا خواہشِ انتفاع اُسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے۔ ان سے اپنی بندگی کرائے۔ ان کے سر اپنے آگے جھکوائے۔ ان پر اپنا حکم چلائے۔ انکو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کرسکا ہے۔ جسکو کچھ طاقت، یا دولت، یا چالاکی و ہوشیاری، یا کسی نوع کا زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بے وقوف، یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جمادے۔

اس قسم کی ہوسِ خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں، اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لیے کافی ذرائع ہوتے ہیں، اس لیے وہ براہِ راست اپنی خدائی کا دعوٰی پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہدیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے)۔ جب حضرت موسٰی نے اسکے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ)۔ اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور کے ساتھ پڑھیے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْكَ ۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ۔ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ كَفَرَ (بقرہ۔ ۳۵)

تونے دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے حجت کی اس بات میں کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ (اور یہ حجت کیوں کی؟) اسلیے کہ اللہ نے اسکو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جسکے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو ذرا اسے مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجیے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لیے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً ارض بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جسکی چاہے جان بخشی کردے، یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے، اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو۔ میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیم نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانونگا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کرونگا جو زمین و آسمان کا رب ہے، اور جسکی عبادت یہ سورج کر رہا ہے، تو وہ حیران رہ گیا، اور اس لیے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں؟

یہ خدائی، جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا

میں ہر جگہ فرمانرواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لیے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور انکے سامنے پورے مراسم عبودیت بجالائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدایگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا، اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ــــ چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آجتک مشہور ہیں ــــ راجہ کو اَن داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمانرواؤں کے لیے الٰہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں، مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خدائی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں الٰہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اُس اقتدار، اُس فرمانروائی و حکمرانی، اُس آقائی و خداوندی کو قائم کرتے ہیں، جسے فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا، دراصل وہ الٰہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں۔ اور وہ سب لوگ جو انکی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہر حال انکے الٰہ اور رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہِ راست اپنی الٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسکے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لیکر اٹھیں اور اسے منوالیں۔ البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں۔ سو ان ذرائع سے کام لیکر وہ کسی روح، کسی دیوتا، کسی بت، کسی قبر، کسی سیّارے، کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ

ومددگار ہیں - ان کو خوش نہ کروگے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کردینگے - انہیں خوش کرکے حاجتیں طلب کروگے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچینگے - مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں - ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں - ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو، اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان مال آبرو سب کچھ دیدو - بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں، اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے -

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں - کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اسکی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہونگے، اور تمہاری پیدائش سے لیکر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائیگی - کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اسکے علم سے محروم کردیتے ہیں، اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کرتے ہیں - یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے، اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنالیتے ہیں - یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے -

اس نظر سے جب آپ دیکھینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصلی جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ - اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں - اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت

کے سارے راز ہی جانتا ہے - مگر اب تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اسکا الٰہ اور ربّ نہ ہو - اگر اللہ کو نہ مانے گا، تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں بہت سے آلہہ اور ارباب اسکی گردن پر مسلط ہو جائینگے -

غور سے دیکھیے - کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس (Political Bureau) کے ارکان باشندگان روس کے ارباب و آلہہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین اُن کا رب الارباب نہیں ؟ روس کا کونسا گاؤں اور کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اِس خدائے روسیاں کی تصویر موجود نہیں ؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے اس میں سوویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی ؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں، گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر سے واقف ہو لیں، تب ان کو دین بالشویکی میں داخل کیا جائے - سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں ؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو، خواہ وہ جماعت (Community) کی نمائندگی ہی کر رہا ہو، کروڑوں انسان کے دماغوں اور ان کی روحوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اسکی شخصیت کا جبروت اور اسکی کبریائی انکے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے ؟ اسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قائم ہوتا ہے - یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے - یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت و نمرودیت کی اور زاریت و قیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں -

اسی طرح اٹلی کو دیکھیے - وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الٰہوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ - جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ کبیر - انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ

رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب و آلہہ بنے ہوئے ہیں۔

غرض آپ جدھر نظر ڈالیں گے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور کہیں ایک ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِی کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے، یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے، جس محیط اور تمام حقائق پر حاوی نگاہ کی ضرورت ہے، جس حکمت اور عدل اور بے خطا میزان کی ضرورت ہے، اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائیگا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں انسانی زندگی میں صحیح توازن کبھی قائم ہی نہ ہو سکا۔ وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اُس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اُس صادق و مصدوق علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قال اللّٰہ عز وجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاءتھم الشیاطین فاجتالتھم من دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم (حدیث قدسی)	اللّٰہ عز وجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے آکر ان کو گھیر لیا، انہیں فطرت کی راہ راست سے ہٹا لے گئے، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا، ان شیطانوں نے انکو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اسکی ساری تباہیوں، اسکی تمام محرومیوں کی اصلی جڑ ہے۔ یہ اسکی ترقی کی راہ میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہ وہ روگ ہے جو اسکے اخلاق اور اسکی روحانیت کو، اسکی علمی و فکری قوتوں کو، اسکے تمدن اور اسکی معاشرت کو، اسکی سیاست اور اسکی معیشت کو، اور قصہ مختصر اسکی انسانیت کو تپِ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اِس روگ کا علاج بجز اسکے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اسکی نجات کے لیے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انسانی زندگی میں انبیاء علیہم السلام نے کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لیے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اِس ظلم سے، اِن جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اِس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ اُن کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اُنہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیے گئے ہیں، اُنہیں ابھار کر اس حد تک اٹھالائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظامِ زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اسکے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ یہی حضرت نوحؑ نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے کہا،[۱] اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ

---

۱ - ملاحظہ ہو سورۂ ھود رکوع ۴ - ۵ - ۶ - ۸ -

علیہ وسلم نے کیا کہ:

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ	میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اُس
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا
وَمَا بَيْنَهُمَا (ص - ۵)	اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔
اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں
وَالْاَرْضَ ۔۔۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ	اور زمین کو۔۔۔۔ اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب
مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف ۷)	اسکے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ	وہ ہے اللہ، وہی تمہارا رب ہے، اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔
كُلِّ شَىْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ (انعام - ۱۳)	وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ ہٰذا تم اسکی بندگی کرو۔ اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ	انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی
لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (البینہ)	کریں، سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی اطاعت کریں۔
تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اور خدائی
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ	میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو
دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)	خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اسکی عقل و فکر اور اسکی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ

یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریۂ سیاسی کا نقطۂ آغاز انبیا علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور اسکی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا اولین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیے جائیں۔ کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اسکی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اسکی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف - ۵)

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران - ۱۶)

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (النحل ۱۵)

اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ - ۷)

جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (Law-giver) صرف خدا ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ ہی کے حکم کا پیرو ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام ۵) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان

سائبیریا کی طرف ہنکا کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اسکے طرز تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کرونگا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کرینگے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں انکی حیثیت کیا ہونی چاہیے، تو آپ کا ذہن خود بخود پکاریگا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی انکو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور - ۷)	اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty) کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق

ہو گی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت | ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت (Democracy) نہیں ہے۔ اس لیے کہ جمہوریت تو نام ہی اُس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو، جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین پر سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے، لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لیے زیادہ صحیح نام ”الٰہی حکومت“ ہے، جسکو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیاکریسی اُس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1]، اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اسکے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (Theo-democracy) یعنی ”الٰہی جمہوری حکومت“ کے نام سے موسوم کرونگا۔ کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اسکے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہکر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔

کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ یعنی (Executive) مسلمانوں کی رائے سے بنیگی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہونگے۔ سارے انتظامی معاملات، اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہونگے۔ اور الہٰی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں، بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی لیجسلیچر کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سر مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے۔

ایک اعتراض آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں۔ اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسکو محفوظ کرنے کے لیے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی، جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (popular sovereignty) ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھیے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اسکو نافذ کرتے ہیں، انہیں

اپنی حاکمیت چند منتخب لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ انکی طرف سے وہ قانون بنائیں اور انہیں نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی، اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈا کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لیے قوانین بناتے ہیں، اور اُسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے، ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو آج جمہوریت کی جنّت ہونے کا دعوی ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (judgment) عموماً ایک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اُس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition law) کی مثال پیش کرونگا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لیے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے، اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لیے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔ مگر جب

وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اسکے خلاف بغاوت کی ۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پییں ۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا ۔ آخرکار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کردی گئی ۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا، اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہوگیا تھا ۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے ۔ انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کردی تھی ۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنالیا تھا، اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اُس قانون کو بدلنے پر مصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کرکے پاس کیا تھا ۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (legislator) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا ۔ اگر اُس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائیگا ۔ اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنالیگا ۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں ۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (Divine limits) کہا جاتا ہے ۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبے کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں ۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں ۔ ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لیے ضمنی اور فروعی قاعدے (Regulations) بنا سکتے ہو ۔ مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے ۔ ان سے تجاوز کروگے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہوجائیگا ۔

حدود اللہ کا مقصد مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاشی معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (class-war) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہوسکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (family life) میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی اور بچوں کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعدد ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ انہی گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے ہی چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔

میرے لیے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لیے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے

اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اسکی روح کی آزادی کو سلب اور اسکی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اسکے لیے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور اسکی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُر پیچ پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان روکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں۔ دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرہ کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رخ پر نہیں اِس رخ پر مڑنا چاہیے تاکہ تو بسلامت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدوں کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لیے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اِس طرف ہے، تجھے اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اِس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ترکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لیے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور کے ساتھ بنے گا۔ جب تک قرآن اور سنت رسول دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے، اسکے لیے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے، اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کے ساتھ بھیجا
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ	اور اسکے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف
النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ	پر قایم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت
بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید۔۳)	ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے۔ اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب آئین میں جو میزان اُن کو دی ہے، یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (well balanced) نظام زندگی کی طرف انکی رہنمائی فرمائی ہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (social justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت)
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	عطا کرینگے تو یہ نماز قائم کرینگے، زکوٰۃ دینگے، نیکی کا حکم کرینگے
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج۔ ۶)	اور بدی سے روکینگے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران۔ ۱۲)	پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کرتا

ہے اس کا مقصد محض سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے - اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، انکی آزادی کی حفاظت کرے، اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے - بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اُس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے - اس کا مقصد بدی کی اُن تمام شکلوں کو مٹانا، اور نیکی کی اُن تمام صورتوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے - اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائیگی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائیگا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائینگے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائیگا -

ہمہ گیر اسٹیٹ اس نوعیت کا اسٹیٹ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کرسکتا - یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے - اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے - یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے - اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (Personal) نہیں کہہ سکتا - اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے - مگر آگے چل کر آپ دیکھینگے کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے، اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے - اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کرسکتا ہے -

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اسکی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، اور جو اسکے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں، بلکہ اسکی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اسکی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی، جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اُس جماعت میں شریک ہوسکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمّی (Subject) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اسکے لیے اسلام کے قانون میں معیّن حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اسکی جان و مال اور عزّت کی پوری حفاظت کی جائیگی، اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہوگا تو اس سے خدمت بھی لی جائیگی، لیکن بہرحال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائیگی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔ یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں ہے جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو، اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر زمین کے جہنم،

سائبیریا کی طرف پبیک کردیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کرسکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اسکے طرزِ تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کرونگا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کرینگے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں انکی حیثیت کیا ہونی چاہیے، تو آپ کا ذھن خود بخود پکاریگا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی انکو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور - ۷)

اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty) کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق

حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمراں ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ (Vicegerent) ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated powers) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا، بلکہ یہ کہا کہ ان کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت (Popular vicegerency) ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راعٍ وکل راعٍ مسئول عن رعیتہ[1]) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حقیقت یہ ہے اسلام میں ڈیموکریسی کی اصلی بنیاد۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :۔

(۱) ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہونگے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہوگی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جسکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے:

لیس لاحدٍ فضل علی احد الا بدین	کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ اگر ہے تو دین کے علم وعمل اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور
وتقویٰ الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب	آدم مٹی سے بنے تھے۔

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ۔	نہ کسی عرب کو عجمی پر فضیلت ہے، نہ عجمی کو عرب پر، نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان، قریش کو، جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یامعشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الآباء ۔ ایھا الناس کلکم من ادم وادم من تراب۔ لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔	قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کردیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نسب کا فخر ہیچ ہے۔ عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

(۲) ایسی سوسائیٹی میں کسی فرد، یا افراد کے کسی گروہ کے لیے اسکی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے (Social starus) یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (Disbilities) نہیں ہوسکتیں جو اسکی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اسکی شخصیت کے ارتقاء میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائیٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اسکے لیے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت واستعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے بغیر اسکے کہ دوسروں کے اسی طور سے بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے

افسر اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے انکی ماتحتی
کی۔ چمار جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اُٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی
اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج انکے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں
ہے کہ اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ
تمہارا سردار ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ بنا دیا جائے

(۳) ایسی سوسائیٹی میں کسی شخص یا کسی گروہ (group) کی ڈکٹیٹرشپ کے لیے کوئی
گنجائش نہیں۔ اسلیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے
انکی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمراں بنایا جاتا ہے اسکی اصلی
حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت
کو انتظامی اغراض کے لیے اسکی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ
ہے اور دوسری طرف اُن عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب
اگر وہ غیر ذمہ دار مطاعِ مطلق، یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار
کرتا ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹرشپ دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ
ایک کلّی اسٹیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے، مگر اس کلیت اور ہمہ
گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمراں کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے
زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائینگی
مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمراں خود (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں
کر سکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں۔ فلاں فن سیکھیں
اور فلاں نہ سیکھیں۔ اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ جو اختیارات

روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں یا جن کو اتاترک نے ٹرکی میں استعمال کیا، اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کیے۔ علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہ شخصی جوابدہی (Personal responsibility) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری طرح آزاد ہونا چاہیے کہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے، اور جدھر اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لیے استعمال کرے۔ اگر امیر اسکی راہ میں رکاوٹ ڈالیگا اور اسکی شخصیت کے نشوونما میں حائل ہوگا تو وہ خود اس ظلم کے لیے اللہ کے ہاں پکڑا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء راشدین کی حکومت میں (Regimentation) کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔

(۴) ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی خاص معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے دوسری طرف اس نے ایسی انفرادیت (Individualism) کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت (Socialism) کی نفی کرتی ہو۔ یہاں فرد اور جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں گم ہو جائے، جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے، اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہو،

جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصدِ حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے، یعنی قانون الٰہی کا نفاذ اور رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح محفوظ کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لیے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت (Harmony) پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشوونما کا پورا موقع بھی ملتا ہے، اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل مبحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سد باب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورۂ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

اسلامی اسٹیٹ کی ہیئت ترکیبی | خلافت عمومی کے تصور کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کو نظر میں رکھنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اُس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اسکے سپرد کر دیتے ہیں۔ اُسکے لیے "خلیفہ" کا لفظ جو استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اسکی ذات میں مرتکز (concentrate) ہو گئی ہے۔

اب میں مختصر طور پر اس طرزِ حکومت کی چند خاص خاص تفصیلات بیان کرونگا تاکہ اس کا ایک واضح خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔

(۱) امیر کا انتخاب ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کے اصول پر ہوگا، یعنی عام مسلمان جس کے کیرکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لیے چنا جائیگا۔ اور جب وہ چن لیا جائیگا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہونگے۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جائیگا جب

تک وہ خدا اور رسول کے قانون کی پیروی کریگا اسکی کامل اطاعت کی جائیگی ۔

(۲) امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا - ہر عامی مسلمان اسکے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا - وہ قابلِ عزل ہوگا - قانون کی نگاہ میں اسکی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی - اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا، اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا ۔

(۳) امیر کو مشورے کے ساتھ کام کرنا ہوگا - مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو - اس امر میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے، اگرچہ اسکی مثال خلافت راشدہ میں نہیں ملتی ۔

(۴) عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہونگے - مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا - قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبك کثرۃ الخبیث - اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو - اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اسلیے چھوڑ دیا جائے کہ اسکی طرف قلت ہے اور باطل کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ ایک جم غفیر اس کی تائید میں ہے - لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ - اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے - مگر ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھینگے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے، یا نفسانیت کے ساتھ - بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار سکتی ہے ۔

(۵) امارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لیے کوئی ایسا شخص منتخب نہ کیا جائیگا جو خود اس کا امیدوار ہو، یا کسی طور پر اس کے لیے کوشش کرے - اسلام میں

امیدواری (Candidature) اور انتخابی پروپیگنڈا کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت ہے کہ امیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔ اسلامی ذہنیت اس بات کے خیال تک سے نفرت کرتی ہے کہ ایک منصب کے لیے دو، تین، چار امیدوار کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی، جلسہ بازی اور اخباری پروپیگنڈا کریں، ووٹروں کو طرح طرح سے بیوقوف بنائیں، کھانوں کی دیگیں چڑھائی جائیں، موٹریں دوڑیں، اور ان میں سے وہ امیدوار بازی لے جائے جو جھوٹ، فریب، اور زرپاشی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ شیطانی ڈیموکریسی کے ملعون طریقے ہیں جن کا عشر عشیر بھی اسلامی حکومت میں برسرکار آئے تو خلافت کی مجلس شوریٰ میں منتخب ہو کر جانا تو درکنار، ایسے لوگوں کو قاضی کی عدالت میں پیش کر کے سزا دلوادی جائے۔

(۶) اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹی بندی نہیں ہو سکتی۔ فرد فرد علیٰحدہ ہوگا اور حق کے مطابق رائے دیگا۔ اسلام میں اس کا موقع نہیں کہ آپ ہر حال میں اپنی پارٹی کے ساتھ رہیں خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ بلکہ اسلامی اسپرٹ کا تقاضا یہ ہے کہ آج کسی کی رائے کو آپ حق پر پائیں تو اس کا ساتھ دیں، اور کل کسی دوسرے مسئلے میں اگر اُسی شخص کی رائے آپ کے نزدیک خلافِ حق ہو تو اس سے اختلاف کر دیں۔

(۷) اسلام میں عدالت کے شعبہ کو انتظامی شعبہ کے اثر سے کلیتہً آزاد رکھا گیا ہے۔ قاضی کا کام خدا کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرنا ہے۔ وہ عدالت کی کرسی پر امیر یا خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل کے نائب کی حیثیت سے بیٹھتا ہے۔ لہٰذا عدالت میں اسکے سامنے خود خلیفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ کسی کو اپنی شخصیت یا اپنے خاندان یا اپنے عہدے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ قاضی کے سامنے حاضر ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایک ادنیٰ

مزدور، ایک غریب کاشتکار، ایک فقیر بے نوا بھی اس کا حق رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے شخص، حتی کہ خود خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کردے۔ اور قاضی کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو خدا کا قانون خلیفہ پر بھی ٹھیک اسی طرح نافذ کردے جس طرح ایک عامی مسلمان پر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خود خلیفہ کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی کے خلاف شکایت ہو تو وہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کر کے خود اس شکایت کو رفع کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ از روئے آئین وہ مجبور ہے کہ ایک عام شہری کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس مختصر خطبہ میں میرے لیے موقع نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ کی تفصیلی صورت آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ اس کی اسپرٹ اور اس کے طرزِ کارروائی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دورِ حکومت کی نظیریں پیش کرنا ضروری ہے اور اس کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کا ایک واضح تصور پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عباداتِ اسلامی پر ایک تحقیقی نظر

عبادت کا جاہلی تصور اسلام میں عبادت کا مفہوم محض پوجا (Worship) کا نہیں ہے بلکہ بندگی (obedience) کا ہے۔ عبادت کو محض پوجا کے معنی میں لینا دراصل جاہلیت کا تصور ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبود کو انسانوں پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ، خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت و عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے پسیج جاتے ہیں، اور اُن سے یونہی کام نکالا جا سکتا ہے، اسی طرح اُن کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہارِ عاجزی کا طالب ہے، انہی تدبیروں سے اس کو اپنے حال پر مہربان کیا جا سکتا ہے اور اس کو خوش کر کے کام نکالا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی بنا پر جاہلی مذاہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا جوگیانہ تصور اسی طرح اسلام میں عبادت کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لَو لگائے، مراقبہ (Meditation) نفس کشی (Self-annihilation) اور مجاہدات و ریاضات (spiritual exercises) کے ذریعہ سے اپنی اندرونی قوتوں کو نشو و نما دے، کشف و کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرے، اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اخروی نجات حاصل کرلے۔ عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور (Ascetic view of life) پر ہے۔ جو اس دنیا کو

انسان کے لیے قید خانہ اور جسم کو روح کے لیے قفس سمجھتے ہیں۔ جن کے نزدیک دینداری اور دنیاداری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے تعلقات سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ جن کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے مادّی انحطاط یا مادیات سے بے تعلقی ناگزیر ہے۔

عبادت کا اسلامی تصور اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا رازق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اُس کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کیے ہیں۔ کچھ ذمہ داریاں اور کچھ خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیت کے ایک حصہ پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے۔ اس کا کام یہاں اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو بجا لانا ہے۔ اپنے اختیارات کو اور اپنی قوتوں کو حاکم اصلی کے قانون اور اسکی رضا کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ جس قدر زیادہ سرگرمی و جانفشانی کے ساتھ وہ زمین کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنی متعلقہ خدمات کو بجا لائیگا اور جتنی زیادہ وفاداری اور فرمانبرداری کے ساتھ اپنے اختیارات کے استعمال میں مالک کے قانون کی پیروی کریگا، اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب ہوگا۔ اسکی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ زمین میں اپنی ماموریت کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس اور مطیع و فرمانبردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سُست، کام چور، نافرض شناس تھا، یا یہ کہ باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور جو ابتدا میں بیان کیے گئے ہیں غلط اور قطعی غلط ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لیے الگ کرتا ہے

اور اُس تھوڑے سے وقت میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں، اسکی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی ملازم جسے آپ نے رات دن کے لیے نوکر رکھا ہو، اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں، وہ بس صبح شام آکر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا پھرے یا جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اسکے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نمازیں پڑھنے، روزے رکھنے، قرآن پڑھنے اور تسبیح پھرانے میں صرف کر دیتا ہے، اسکی مثال اُس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں، مگر وہ باغ کو اور اسکے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے، اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ بس پڑھتا ہی رہے، اُن کے مطابق باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کام ذرا نہ کرے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کرینگے وہی رائے اسلام کی بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق ہے۔ اور جو برتاؤ اس قسم کے ملازموں کے ساتھ آپ کرینگے وہی برتاؤ ان غلط تصورات کے تحت عبادت کرنے والوں کے ساتھ خدا بھی کریگا۔

اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو۔ آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم (whole-time servant) سمجھیں۔ آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں۔ آپ کا سونا اور جاگنا، آپ کا کھانا اور پینا، آپ کا چلنا اور پھرنا، غرض سب کچھ خدا کے قانونِ شرعی[۱] کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جن تعلقات میں آپ کو باندھا ہے اُن سب میں آپ بندھیں،

[۱] موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قانون شرعی (Moral law) اور قانون طبیعی (Physical law) (۴۹) بقیہ حاشیہ دیکھیے صفحہ ۵۰ پر

اور اُن کو اُس طریقے سے جوڑیں یا توڑیں جس طریقے سے خدا نے انہیں جوڑنے یا توڑنے کا حکم دیا ہے۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں اور دنیوی زندگی میں جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں، اُن سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ سنبھالیں اور ان کو اس طریقہ سے ادا کریں جسکی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور یہ سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلہ میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائیٹی میں دوستوں کے ساتھ، اور اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔ جب آپ رات کے اندھیرے میں ہوں اور کوئی نافرمانی اس طرح کر سکتے ہوں کہ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ ہو، اُس وقت بھی آپ کو یہ خیال رہے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب آپ جنگل میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹ ـ کے فرق کو نظر انداز کر کے گمراہیوں کا ایک عظیم الشان فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ اُن کے نزدیک عبادت الٰہی محض قانونِ طبیعی کی پیروی کا نام ہے قطع نظر اسکے کہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ اُن لوگوں کو بھی خدا کا عبادت گذار اور خلیفۂ الٰہی اور صالح و مومن قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبیعی کے ماتحت تنظیم اور سائنٹفک ایجادات کے ذریعے سے طاقت بہم پہنچا لیں اگرچہ اس طاقت سے کام لینے میں خدا کے قانون شرعی کے پابند نہ ہوں۔ یہ ایسی زبردست غلطی ہے جس نے کفر کو عین اسلام، بغاوت کو عین عبادت اور معصیت کو عین طاعت بنا کر رکھ دیا ہے، اور اسلام کے مشن کی اصلی روح ہی کو مسخ کر ڈالا ہے۔ اِن صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے آنے کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی کو قانون طبیعی سے قانونِ شرعی کے تحت کام لینے کی تعلیم دے۔ اگر انسان محض قانون طبیعی کے تحت عمل کرنے کے لیے ہوتا تو اِس چیز کی تعلیم دینے کے لیے کسی نبی اور کسی کتاب کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسکے لیے تو حیوانی جبلت ہی کافی تھی۔ اگر آدمی کا کام محض قانون طبیعی پر عمل کرنا ہی ہو تو اُس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس طرح بھیڑیا بکری کو پھاڑ کھاتا ہے، اور یہ اسکے لیے قانون طبیعی ہے، اسی طرح ایک آدمی اگر دوسرے آدمی سے زیادہ طاقت رکھتا ہے اور اس کو پھاڑ کھاتا ہے تو یہ اسکے لیے بھی قانون طبیعی ہے۔ ایک قوم اگر دوسری قوم سے زیادہ ہوائی جہاز اور بم بنا سکتی ہے اور اس طاقت سے کام لے کر اسے اپنا بندہ بنا لیتی ہے تو یہ بھی اس کے لیے قانون طبیعی ہے۔ یہ نظریہ انسان کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر درندوں اور موذی جانوروں کے مرتبہ میں پہنچا دیتا ہے، اور اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہے کہ انسان کی اس حیوانیت کو خدا کی عبادت قرار دے۔

جارہے ہوں اور وہاں کوئی جرم اس طرح کر سکتے ہوں کہ کسی پکڑنے والے اور کسی گواہی دینے والے کا کھٹکا نہ ہو، اُس وقت بھی آپ خدا کو یاد کر کے ڈر جائیں اور جرم سے باز رہیں۔ جب آپ جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم سے بہت سا فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور کوئی آپ کو روکنے والا نہ ہو، اُس وقت بھی آپ خدا سے ڈریں اور اس فائدے کو اسلیے چھوڑ دیں کہ خدا اس سے ناراض ہوگا۔ اور جب سچائی اور ایمانداری میں سراسر آپ کو نقصان پہنچتا ہو، اُس وقت بھی آپ نقصان اٹھانا قبول کرلیں، صرف اس لیے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں ہے، بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر اللہ اللہ جاری ہو، بلکہ اصلی ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں اُن میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصلی مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنو اور پھر خوف خدا تمہیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہانبانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت اور مالیات اور صنعت کی باگیں سنبھالو

اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو۔ ایک ایک قدم پر حرام تمہارے سامنے ہزار خوبصورتیوں کے ساتھ آئے اور پھر تمہاری رفتار میں لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم اور جھوٹ اور دغا اور فریب اور بدکاری کے راستے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادّی لذتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف تمہارے لیے بندِ پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک حد کے قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل وصداقت پر قائم رہنے میں جان ومال کا زیاں نظر آئے، اور خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین وآسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہو جائے، پھر بھی تمہارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمہاری جبینِ عزم پر شکن تک نہ آنے پائے۔ یہ ہے اصلی عبادت۔ اس کا نام ہے یادِ خدا۔ اسی کو ذکر الٰہی کہتے ہیں، اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَوٰةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

روحانی ارتقاء اور خدا کی یافت کا راستہ اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا عزلت کے گوشوں میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملیگا اور اس قدر قریب ملیگا کہ گویا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے حرام کے فائدے، ظلم کے مواقع اور بدکاری کے راستے قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اُسے خدا کی یافت ہو گئی۔ ہر قدم پر وہ اپنے خدا کو پاتا رہا۔ بلکہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ نہ پاتا اور نہ دیکھتا تو اس دشوار گذار گھاٹی سے بخیریت کیونکر گذر سکتا تھا؟ جس نے گھر میں، بازار میں، تفریح کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنگاموں میں ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے اُس نے خدا کو

ہر لمحہ اپنے سے قریب اور بہت قریب پایا۔ جس نے سیاست اور حکومت اور جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کا پابند رہا اُس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اُس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اگر وہ خدا کا ولی اور مقرب بندہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشوونما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام نہیں ہے کہ آپ پہلوان کی طرح ورزشیں کر کے اپنی قوت ارادی (will power) کو بڑھا لیں اور اس کے زور سے کشف و کرامت کے شعبدے دکھانے لگیں۔ بلکہ روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اور اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں۔ دنیوی زندگی میں، جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے چلیں، اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اُس طریقہ پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایانِ شان ہے، تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائیگی اور آپ روز بروز خدا سے قریب ہوتے جائینگے۔ اس کے سوا روحانی ترقی اور کسی چیز کا نام نہیں۔

اسلام میں مراسم عبادت کی کیا حیثیت ہے؟ یہ خلاصہ ہے اسلامی تصورِ عبادت کا۔ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے، اُس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے، اور بندہ بنکر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی سی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے

ادا کر دیا جا سکتا ہے، مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے۔ مضبوط کیرکٹر پیدا کیا جائے۔ عادات اور خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے۔ اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر لیا جائے۔ بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو، اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اُسکی مددگار اور اُسکی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس اصلی عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں۔ یہ اُس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اُس خاص کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے، اور اُس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادتِ الٰہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانِ اسلام[۵۵] قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

---

۵۵ انہی صاحب نے جنکا ذکر اس سے پہلے حاشیہ میں کیا جا چکا ہے، کلمۂ شہادت اور اِن چاروں عبادتوں کے ارکان اسلام ہونے کا صاف انکار کر دیا ہے اور اس کے بجائے اپنی طرف سے اسلام کے دس ارکان تصنیف کیے ہیں۔ یہ صاحب جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ انکو نہ اسلام سے کوئی واقفیت ہے، نہ لفظ رکن کے معنی و مفہوم کو وہ جانتے ہیں، نہ انہیں یہ خبر ہے کہ یہ پانچوں چیزیں کس حیثیت سے اسلام کی رکن قرار دی گئی ہیں، نہ وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اگر یہ پانچوں چیزیں موجود نہ ہوں تو اسلام سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں رہتا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر نے جن چیزوں کو ارکان اسلام قرار دیا ہے، اُن کو تو یہ حضرت فرماتے ہیں کہ ارکان اسلام نہیں ہیں۔ اور خود انہوں نے جن دس باتوں کو تصنیف کیا ہے انہیں یہ ارکان اسلام قرار دیتے ہیں۔ گویا آنجناب کے نزدیک اسلام اُس دین کا نام نہیں ہے جسے خدا کے رسول نے پیش کیا تھا، بلکہ جس چیز کو یہ کیمبرج کا رنگیلا وضع کرے اس کا نام اسلام ہے۔ ایک طرف ان بزرگ کے یہ تفاولات ہیں اور دوسری طرف عام لوگوں میں علم کی کمی اور دنیا پرستی کی زیادتی کا یہ حال ہے کہ ایسے شخص کی قیادت میں جو تنظیم ہو اسے وہ اسلامی تنظیم اور اسلامی نظام امارت سمجھتے ہیں۔ گویا انکے نزدیک امیر کے عقیدہ اور علم دین اور اخلاق کو دیکھنے کی حاجت نہیں۔ نفس تنظیم اور نفس نظام امارت مقصود بالذات ہے، خواہ عمر فاروق کے تحت ہو، خواہ ہٹلر یا مسولینی کے تحت ہی میسر آجائے۔ خدا کی پناہ۔ (۵۴) اس دور کے فتنے کس حد تک پہنچ رہے ہیں!

آئیے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے، اور کس طرح انسان کو اُس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

۱۔ نماز

یاد دہانی انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسکے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر وقت کارفرما ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اسے دنیا میں سب کچھ بندہ ہونے کی حیثیت ہی سے کرنا ہے۔ اس شعور کو بار بار ابھارنے اور تازہ کرنے کی ضرورت اسلیے لاحق ہوتی ہے کہ انسان درحقیقت جس کا بندہ ہے وہ تو اُس کی آنکھوں سے اوجھل اور اس کے حواس سے دور ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک شیطان خود آدمی کے اپنے نفس میں موجود ہے جو ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے۔ اور لاکھوں کروڑوں شیطان ہر طرف دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دعویٰ کر رہا ہے کہ تو میرا بندہ ہے یہ شیاطین آدمی کو محسوس ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں اور ہر آن نت نئے طریقوں سے اپنی طاقت اس کو محسوس کراتے رہتے ہیں۔ ان دوگونہ اسباب سے یہ شعور کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور اسکے سوا مجھے کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے، آدمی کے ذہن سے گُم ہوجاتا ہے۔ اس کو زندہ اور کارفرما رکھنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا زبان سے اقرار کرلے، یا محض ایک علمی فارمولا کی حیثیت سے اس کو سمجھ لے، بلکہ اسکے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے بار بار اُبھارا اور تازہ کیا جائے ــــ یہی کام نماز کرتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے وہ آپ کو یہی بات یاد دلاتی ہے۔ پھر جب آپ دن کو اپنے کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ہنگامۂ سعی و عمل کے دوران میں دو دفعہ آپ کو تھوڑی دیر کے لیے الگ کھینچ بلاتی ہے تاکہ احساسِ بندگی کا نقش اگر دھندلا ہوگیا ہو تو اُسے تازہ کردے۔ پھر شام کو جب تفریحوں اور دلچسپیوں کا وقت آتا ہے تو پھر یہ آپ کو

آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو شیطانِ نفس کے بندے نہیں ہو۔ اسکے بعد رات آتی ہے، وہ رات جسے اندر کا شیطان اور باہر کے شیاطین، سب مل کر معصیتوں سے سیاہ کر دینے کے لیے دن بھر منتظر رہتے ہیں۔ نماز پھر سامنے آ کر آپ کو خبردار کرتی ہے کہ تمہارا کام خدا کی بندگی کرنا ہے نہ کہ ان شیاطین کی۔

یہ نماز کا پہلا فائدہ ہے۔ اسی بنا پر اسے قرآن میں ذِکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اگر نماز میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تب بھی صرف یہی ایک صفت اس کو رکن اسلام قرار دینے کے لیے کافی تھی، کیونکہ اس فائدے کی اہمیت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی زیادہ اس امر کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کا عملاً بندۂ خدا بن کر رہنا اس یاد دہانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

فرض شناسی پھر چونکہ آپ کو اس زندگی میں ہر قدم پر خدا کے احکام بجا لانے ہیں، خدا کی سپرد کی ہوئی خدمات اُس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی نگہداشت کے ساتھ انجام دینی ہیں، اسلیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ میں فرض شناسی پیدا ہو، اور فرض کو مستعدی و فرمانبرداری کے ساتھ انجام دینے کی عادت آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فرض کیا بلا ہوتی ہے اور اس کا فرض ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی ادائے فرض کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو شخص فرض کے معنی تو جانتا ہو مگر اسکی تربیت اتنی خراب ہو کہ فرض کو فرض جاننے کے باوجود وہ اسے ادا کرنے کی پروا نہ کرے، اس کے کیرکٹر پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور نہ وہ کسی عملی خدمت (active service) کا اہل ہو سکتا ہے۔ پس یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جن لوگوں کو کسی ذمہ دارانہ خدمت پر مامور کیا جائے اُن کے لیے فرض شناسی اور اطاعتِ امر کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ کام کے آدمی تیار ہوتے رہتے ہیں، بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے

کہ روزانہ کار آمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کے درمیان تمیز ہوتی رہتی ہے۔ روز یہ فرق کھلتا رہتا ہے کہ جو لوگ خدمت کے امیدوار ہیں اُن میں کون قابل اعتماد ہے اور کون نہیں ہے۔ تمام عملی خدمات کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ ہمیشہ بالالتزام عملی آزمائش (Practical test) کی کسوٹی پر آدمیوں کو پرکھا جاتا رہے تاکہ ناقابل اعتماد آدمی ملازمت میں نہ رہنے پائیں۔

فوج کو دیکھیے۔ کن کن طریقوں سے وہاں ڈیوٹی کو سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان سے قواعد کرائی جاتی ہے۔ یہ سب کس لیے ہے؟ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سپاہیوں کو حکم بجالانے کی عادت ہو۔ ان میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو۔ ان میں ایک نظام اور ترتیب کے ساتھ کام کرنے کی خصلت پیدا ہو۔ اور اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی آزمائش کی جاتی رہے۔ روز یہ فرق کھلتا رہے کہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں اُن میں سے کون کام کے آدمی ہیں اور کون ناکارہ ہیں۔ جو سست اور نالائق لوگ بگل کی آواز سن کر گھر بیٹھے رہیں، یا قواعد میں حکم کے مطابق حرکت نہ کریں، انہیں پہلے ہی فوج سے نکال باہر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان پر یہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ جب کام کا وقت آئیگا تو وہ فرض کی پکار پر لبیک کہینگے۔

دنیوی فوجوں کے لیے تو کام کا وقت برسوں میں کبھی آتا ہے، اور اُس کے لیے یہ اہتمام ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی تربیت اور انکی آزمائش کی جاتی ہے۔ مگر اسلام جو فوج بھرتی کرتا ہے اسکے لیے ہر وقت کام کا وقت ہے۔ وہ ہر وقت برسرِ کار (on duty) ہے۔ اس کے لیے ہر وقت معرکۂ کارزار گرم ہے۔ اسے زندگی میں ہر آن ہر لمحہ فرائض ادا کرنے ہیں، خدمات بجالانی ہیں، شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے، اور احکام شاہی کو نافذ کرنا ہے۔ اسلام محض ایک اعتقادی مسلک نہیں ہے بلکہ عملی خدمت ہے، اور عملی خدمت بھی ایسی جس میں

رخصت، تعطیل، آرام کا کوئی وقت نہیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے پیہم اور مسلسل خدمت ہی خدمت ہے۔ اب فوج کی مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ایسی سخت عملی خدمت کے لیے کتنے سخت ڈسپلن، کیسی زبردست تربیت اور کتنی شدید آزمائش کی ضرورت ہے۔ محض عقیدہ Creed کا زبانی اقرار اسکے لیے کیونکر کافی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اُس فوج میں رکھ لیا جائے جس کو اتنی اہم خدمت انجام دینی ہے۔ عقیدہ کا اقرار تو صرف اس ملازمت میں داخل ہونے کے لیے امیدواری کا اعلان ہے۔ اس اعلان کے بعد یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے ڈسپلن کے شکنجہ میں کسا جائے اس ڈسپلن میں رہ کر ہی وہ اسلام کے کام کا بن سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو اس شکنجہ کی گرفت میں دینے پر تیار نہیں، اگر وہ فرض کی پکار پر نہیں آتا، اگر وہ احکام کی اطاعت کے لیے کوئی مستعدی اپنے اندر نہیں رکھتا تو وہ اسلام کے لیے قطعی ناکارہ ہے۔ خدا کو اور اسکے دین کو ایسے فضول آدمی کی کوئی حاجت نہیں۔

یہی دو گونہ اغراض ہیں جن کے لیے نماز رات دن میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ روزانہ پانچ بار بگل بجاتی ہے تاکہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں اور ثابت کریں کہ وہ فرض کو پہچانتے ہیں، اللہ کے وفادار ہیں، اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں، اور اسکے احکام بجالانے کے لیے مستعد ہیں۔ اس طریقہ سے ایک طرف سپاہیوں کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف مومن اور منافق کا فرق کھلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس آواز پر پابندی کے ساتھ آتے ہیں اور ضابطہ کے مطابق حرکت کرتے ہیں، ان میں فرض شناسی، مستعدی، انضباط اور اطاعتِ امر کا مادّہ نشوونما پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس آواز کو سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ فرض کو پہچانتے نہیں، یا پہچانتے ہیں تو اسے ادا کرنے کے لیے مستعد نہیں ہیں۔ یا تو وہ اس اقتدار (authority) ہی کو

تسلیم نہیں کرتے جس نے اسے فرض قرار دیا ہے - یا پھر ان کی ذہنی حالت اتنی ناقص ہے کہ جسے اپنا الٰہ اور رب مانتے ہیں اسکے پہلے اور اہم ترین حکم کو بھی بجالانے کے لیے تیار نہیں وہ اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو صادق الایمان (true to their conviction) نہیں ہیں - ان میں یہ صفت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ جس چیز کو حق جانیں اسکے مطابق عمل کرنے کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے تیار رہیں - پہلی صورت میں وہ مسلمان نہیں ہیں اور دوسری صورت میں وہ اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ اسلامی جماعت میں رہنے کے قابل نہیں -

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ - یعنی جو لوگ خدا کی اطاعت و بندگی کے لیے تیار نہیں ہیں صرف انہی پر نماز گراں گذرتی ہے - بالفاظ دیگر جس پر نماز گراں گذرے وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے - اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ " اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز کے پابند ہوں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں " یعنی نماز کے بغیر آدمی اسلام کی دینی برادری میں شامل ہی نہیں ہو سکتا - اسی بنا پر قرآن کے بارے میں فرمایا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ " یہ کتاب صرف ان پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے جو اَن دیکھی حقیقت پر ایمان لائیں اور نماز کے پابند ہوں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں دیں " اسی بنا پر منافقین کی یہ صفت بیان کی گئی کہ اَلَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ، یعنی وہ اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں ، اور وَاِذَا قَامُوا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى ، یعنی وہ نماز کے لیے اس طرح کسمساتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہیں کہ گویا ان کی جان پر بن رہی ہے -

اسی بنا پر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ " بندے اور

کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ واسطہ ہے" یعنی ترک صلوٰۃ وہ پُل ہے جس کو عبور کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔ اسی بنا پر رحمۃ للعالمین نے فرمایا کہ "جو لوگ اذان کی آواز سُن کر گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر اُن کے گھروں میں آگ لگا دوں"۔ اور اسی بنا پر فرمایا کہ العہد بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر۔ "ہمارے اور عرب کے بدوؤں کے درمیان تعلق کی بنا نماز ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا وہ کافر قرار پائیگا اور اس سے ہمارا تعلق ٹوٹ جائیگا"۔ آج دین سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، جو اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے، جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ موذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لیے بلا رہا ہے، وہ بھی مسلمان سمجھے جاتے ہیں، اور یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ نماز کی کوئی خاص اہمیت اسلام میں نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان ہو سکتا ہے بلکہ مسلمانوں کا امام اور ملت کا قائد بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ تھا اس وقت یہ حال نہ تھا۔ مستند روایت ہے کہ کان اصحاب النبی صلعم لا یرون شیئًا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے جسکو چھوڑ دینا کفر ہے۔

تعمیر سیرت نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اُس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے، یا بالفاظ دیگر، زندگی کو خدا کی عبادت بنا دینے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے، جیسے مقاصد اسکے پیش نظر ہوتے ہیں، انہی کے لحاظ سے سیرت بنانے کے لیے ایک نظام تربیت وضع کیا جاتا ہے۔ مثلاً سلطنتوں کی سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے، اسلیے سول سروس کی ٹریننگ میں تمام تر زور حکومت مقتدرہ کی وفاداری اور نظم مملکت

(Administration) کی صلاحیتیں پیدا کرنے ہی پر صرف کیا جاتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت کا وہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ زندگی خواہ کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو، ایک شخص اس کے باوجود سول سروس میں داخل ہو سکتا اور ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت میں راستی اور حق کے اصولوں کی پابندی کرنا اور اخلاق کو سیاست کی بنیاد بنانا وہاں سرے سے پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ اسی طرح فوجوں کی تنظیم کا مقصد جنگ کی قابلیت بہم پہنچانا ہوتا ہے اس لیے سپاہیوں کی تربیت محض اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ انہیں مار دھاڑ کے لیے تیار ہونا ہے۔ انہیں پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ منظم صورت میں کام کر سکیں۔ انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے تاکہ کشت و خون کے فن میں ماہر ہو جائیں۔ ان کو اطاعتِ امر کا خوگر بنایا جاتا ہے تاکہ حکومت جہاں اور جس غرض کے لیے بھی انکے دست و بازو سے کام لینا چاہے وہاں وہ بے تامل کام کریں۔ اسکے ماسوا کوئی بلند تر اخلاقی مقصد چونکہ پیشِ نظر ہی نہیں ہوتا اس لیے فوجوں کی سیرت میں تقویٰ پیدا کرنے کا خیال تک کسی کو نہیں آتا۔ سپاہی اگر ڈسپلن کے پابند ہیں تو حکومت کے مقصد کے لیے بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد کچھ پروا نہیں اگر وہ زانی، شرابی، جھوٹے، بددیانت اور ظالم ہوں۔

اسلام اس کے برعکس ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا مقصدِ اول نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے۔ جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض تمدن کے ہر شعبے میں اخلاق کے مستقل اصولوں کی پابندی کرنی ہے۔ جسے زمین پر خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اہل کار، سپاہی اور افسر ایک دوسرے نظامِ تربیت کے تحت تیار کرتا ہے تاکہ ان کے اندر وہ سیرت پیدا ہو جو اس خاص نوعیت کی خدمت سے مناسبت رکھتی ہو۔ اس سیرت کی بنیاد اسلام کے ایمانیات ہیں۔ خدا کا خوف،

اسکی محبت، اُس کا عشق، اُس کی خوشنودی کو مقصدِ زندگی قرار دینا، اس کو حاکمِ اصلی سمجھنا، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ خیال کرنا، اور یہ جاننا کہ ایک روز وہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے، یہی وہ اساسی تصورات ہیں جن پر اسلامی سیرت کی بنا قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر وقت ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے۔ اسکی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے۔ اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے۔ تنہائی میں بھی اسکے ساتھ ہے۔ اسکے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اس کے دماغ میں جو خیالات اور ارادے پیدا ہوتے ہیں اُن سے بھی وہ ناواقف نہیں۔ تمام دنیا سے چھپ جانا ممکن ہے مگر خدا سے چھپنا غیر ممکن۔ تمام دنیا کی سزاؤں سے آدمی بچ سکتا ہے مگر خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ دنیا میں نیکی ضائع ہو سکتی ہے بلکہ نیکی کا بدلہ بدی کی صورت میں بھی مل سکتا ہے مگر خدا کے ہاں یہ ممکن نہیں۔ دنیا کی نعمتیں محدود ہیں مگر خدا کی نعمتیں بے حد وحساب ہیں۔ دنیا کا نفع ونقصان فانی اور آنی ہے مگر خدا کے ہاں جو نفع یا نقصان ہے وہ پائدار ہے۔ یہی یقین آدمی کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی کے زور سے وہ حلال وحرام کی اُن حدود کا لحاظ رکھنے پر مجبور ہوتا ہے جو خدا نے زندگی کے معاملات میں قائم کی ہیں۔ یہی چیز اسے خواہشات کی بندگی سے، ناجائز منفعتوں اور لذتوں کے لالچ سے اور بد اخلاقی کے مفید مطلب ذرائع اختیار کرنے سے بچاتی ہے۔ اسی میں یہ طاقت ہے کہ آدمی کو عدل، صداقت، حق شناسی وحق پرستی، اور مکارمِ اخلاق کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے، اور اسے دنیا کی اصلاح کے اُس کٹھن کام پر اٹھنے کے لیے آمادہ کرے جسکی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا تصور بھی کوئی غیر مومن انسان برداشت نہیں کر سکتا۔

نماز وہ چیز ہے جو ان تصورات کو بار بار تازہ کرتی اور ذہن میں گہری جڑوں کے ساتھ

بٹھاتی رہتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل، اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے، کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود آدمی کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیے! نماز کا ارادہ کرتے ہی سب سے پہلے آپ اپنا جائزہ لیتے ہیں کہ ناپاک تو نہیں ہوں؟ کپڑے تو نجس نہیں ہیں؟ وضو ہے یا نہیں؟ غور کیجیے یہ خیال آپ کو کیوں آتا ہے؟ اگر آپ نجس حالت میں نماز کے لیے جا کھڑے ہوں یا بے وضو کھڑے ہو جائیں تو کون آپ کو پکڑ سکتا ہے؟ کس کو آپ کے حال کی خبر ہو سکتی ہے؟ پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ آپ کو خدا کا خوف ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اُس سے کوئی راز نہیں چھپ سکتا، اور اس امر پر ایمان ہے کہ آخرت میں اس فعل کا جواب دینا پڑیگا۔ یہی چیز آپ سے طہارت اور وضو کے اُن تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کراتی ہے جو نماز کے لیے مقرر کیے گئے ہیں ورنہ کوئی دُنیوی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو آپ سے ان کی پابندی کرانے والی ہو۔

اس کے بعد آپ نماز شروع کرتے ہیں۔ یہاں آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قیام و قعود اور رکوع و سجود کی حالتوں میں قرآن کی آیات یا دعائیں یا تسبیحیں جس جس طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح ان کو پڑھیں۔ آخر یہ پابندی آپ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ساری چیزیں تو آہستہ پڑھی جاتی ہیں۔ اگر آپ انہیں نہ پڑھیں یا ان کی جگہ کچھ اور پڑھ دیں، یا ان میں اپنی طرف سے کچھ الٹی سیدھی باتیں ملا دیں تو کسی کو بھی آپ کے اس فعل کی خبر نہیں ہو سکتی۔ پھر بتائیے، کس کا خوف، کس کے واقفِ اَسرار ہونے کا یقین اور کس کی جزا و سزا پر ایمان آپ کو ٹھیک ٹھیک نماز ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے؟

نماز کے اوقات آپ پر مختلف حالتوں میں آتے ہیں۔ کبھی آپ جنگل میں ہوتے ہیں۔ کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی گھر کی تنہائی میں۔ کبھی اپنی دلچسپ تفریحوں میں مشغول ہوتے ہیں اور کبھی اپنے کاروبار میں منہمک۔ کبھی سردی کی شدّت لحاف سے سر نکالنے تک کی اجازت نہیں دیتی، اور کبھی چلچلاتی دھوپ گھر سے قدم نکالتے ہی بھون ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ غرض اسی طرح کی بے شمار مختلف حالتیں آپ پر رات دن میں آتی رہتی ہیں۔ ان سب حالتوں میں کون سی طاقت آپ کو نماز کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے؟ اگر وہ خدا پر ایمان، اسکے سمیع و علیم ہونے کا یقین، اسکی ناراضی کا خوف اور اسکی رضا کی طلب نہیں تو اور کیا ہے؟

اب ذرا اُن چیزوں پر ایک نظر ڈالیے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں اول سے لیکر آخر تک ایک ایک لفظ ایسا ہے جو اسلام کے بنیادی تصورات اور اسکی اسپرٹ سے لبریز ہے ان مضامین کو بار بار پڑھنے سے وہ تمام ایمانیات بار بار تازہ اور بار بار ذھن نشین ہوتے رہتے ہیں جن پر اسلامی سیرت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے اذان کو لیجیے۔ روزانہ پانچ وقت آپ کو کن الفاظ میں نماز کی اطلاع دی جاتی ہے؟ اللہ اکبر، اللہ اکبر "خدا سب سے بڑا ہے، خدا سب سے بڑا ہے"۔ اشھدان لا الٰہ الا اللہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی اس لائق نہیں کہ اسکی بندگی کی جائے"۔ اشھد ان محمد الرسول اللہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں" حی علی الصلوٰۃ "آؤ نماز کے لیے" حی علی الفلاح "آؤ اس کام کے لیے جس میں فلاح اور بہبودی ہے" اللہ اکبر، اللہ اکبر "اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے" لا الٰہ الا اللہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"

دیکھو! یہ کیسی زبردست پکار ہے۔ ہر روز پانچ مرتبہ یہ آواز کس طرح تمہیں یاد دلاتی ہے

کہ زمین میں جتنے خدائی کے دعویدار پھر رہے ہیں یہ سب جھوٹے ہیں، زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کے لیے بڑائی ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے، آؤ اُس کی عبادت کرو، اُسی کی عبادت میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ کون ہے جو اس آواز کو سن کر ہل نہ جائیگا؟ کیونکر ممکن ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو وہ اتنی بڑی بات کی گواہی اور ایسی زبردست پکار کو سن کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جائے اور اپنے مالک کے آگے سر جھکانے کے لیے دوڑ نہ پڑے؟

اس کے بعد تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو۔ منہ قبلہ کے سامنے ہے۔ پاک صاف ہو کر بادشاہ عالم کے دربار میں حاضر ہو۔ سب سے پہلے تمہاری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ "میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اُس ذات کی طرف پھیر دیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدائی میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں"۔

اس دو ٹوک بات کا اقرار کر کے تم کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہو، گویا دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو رہے ہو۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہو، گویا اب تم بالکل اپنے بادشاہ کے سامنے مؤدّب، دست بستہ کھڑے ہو۔ اس کے بعد تم کیا عرض معروض کرتے ہو؟

(باقی)

رسائل و مسائل

مغربی نیشنلزم اور فرنگی لباس

(۳)

(ابسلسلۂ اشاعت رجب ۵۸ھ)

نیشنلزم ہندوستان میں | پچھلے صفحات میں یہ بات اصولی حیثیت سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اجتماعیات میں نیشنلزم کا نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر سے کلی طور پر متناقض ہے۔ لہٰذا مسلمان اگر اُس شخص کا نام ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نقطۂ نظر رکھتا ہو، اور اگر اس کے سوا لفظ مسلمان کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے، تو یہ بات آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہے کہ مسلمان جہاں اور جس حال میں بھی ہو، اسے نیشنلزم کی مخالفت کرنی چاہیے۔ یہ اصول طے ہو جانے کے بعد درحقیقت اس سوال میں کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی کہ کسی خاص ملک کی تحریکِ قوم پرستی کے بارے میں مسلمان کا رویہ کیا ہو۔ لیکن جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینا چاہیے، اور یہ کہ اسی چیز کے فروغ پانے پر اس ملک کی نجات منحصر ہے، تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مخصوص طور پر ہندوستان کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ دیکھیں کہ یہاں نیشنلزم کے فروغ پانے کا نتیجہ کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے اور یہ کہ آیا فی الواقع ہندوستان کی نجات اسی طریقہ میں ہے؟

کسی ملک میں نیشنلزم پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں پہلے سے ایک قومیت موجود ہو، یا اگر وہ پہلے سے موجود نہیں ہے تو اب وجود میں آئے۔ کیونکہ جہاں قومیت ہی سرے سے موجود

نہ ہو وہاں قوم پرستی کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی - قوم پرستی تو قومیت کے اشتعال ہی کا دوسرا نام ہے۔
جب شعلہ ہی موجود نہ ہوگا تو اشتعال کیسے ہوگا؟

اب دیکھنا چاہیے کہ قوم پرستی کا شعلہ بھڑکنے کے لیے کس قسم کی قومیت درکار ہے۔

قومیت کی ایک قسم وہ ہے جسے سیاسی قومیت (Political nationality) کہتے ہیں، یعنی جو لوگ ایک سیاسی نظام سے وابستہ ہوں وہ محض اس وحدت سیاسی کے لحاظ سے ایک قوم سمجھے جاتے ہیں - اس نوع کی قومیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ اس میں شریک ہوں اُن کے جذبات وحسیات، ان کے خیالات ونظریات، اُن کے اخلاقی خصائص، اُن کی روایات، اُن کی زبان اور لٹریچر اور اُن کے طرزِ زندگی میں کسی قسم کی یکسانی پائی جائے۔ اِن تمام حیثیات سے بالکل مختلف ہونے کے باوجود اُن کی ایک سیاسی قومیت ہوتی ہے اور اُس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ ایک سیاسی نظام سے وابستہ رہیں - اگر ان کے مختلف گروہ آپس میں مختلف ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہوں حتیٰ کہ اگر اُن کے مقاصد اور قومی حوصلے باہم متضاد ہوں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف عملاً جدوجہد کر رہے ہوں، تب بھی ان کی سیاسی قومیت ایک ہی رہتی ہے — قومیت کا لفظ ایسی وحدت کے لیے بولا ضرور جاتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ قومیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر کہیں قوم پرستی پیدا ہو سکتی ہو۔

دوسری قسم کی قومیت وہ ہے جسے تہذیبی قومیت (Cultural nationality) کہا جاتا ہے - یہ قومیت صرف ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کا مذہب ایک ہو، جن کے خیالات ونظریات اور جذبات وحسیات یکساں ہوں، جن میں ایک ہی طرح کے اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہوں، جو زندگی کے تمام اہم معاملات میں ایک مشترک زاویۂ نگاہ رکھتے ہوں اور اُسی زاویۂ نگاہ کے اثر سے اُن کی زندگی کے تہذیبی وتمدنی مظاہر میں بھی یک رنگی پیدا ہو گئی ہو، جو پسندیدگی وناپسندیدگی

اور حرمت و حلت اور تقدیس و استکراہ کے مشترک معیار رکھتے ہوں، جو ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہوں، اور ایک دوسرے کی عادات و خصائل اور دلچسپیوں سے مانوس ہوں جن میں آپس کے شادی بیاہ اور مشترک معاشرت کی وجہ سے خونی اور قلبی رشتے پیدا ہو گئے ہوں، جنہیں ایک ہی قسم کی تاریخی روایات حرکت میں لاسکتی ہوں، مختصر یہ کہ جو ذہنی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے ایک گروہ، ایک جماعت، ایک وحدت بن گئے ہوں — قوم پرستی اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف اسی قومیت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں میں یہ قومیت پائی جاتی ہے صرف انہی کے درمیان ایک مشترک نیشنل ٹائپ اور ایک مشترک نیشنل آئیڈیا کا نشوونما ہوتا ہے۔ اسی نیشنل ٹائپ کے عشق اور نیشنل آئیڈیا کے استحکام سے نیشنلزم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی چیز آگے بڑھ کر وہ قومی خودی (National self) پیدا کر دیتی ہے جس میں فرد اپنی انفرادی خودی کو جذب کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر جب قومی خودی کے ارتقاء میں کوئی واقعی یا خیالی چیز مانع ہوتی ہے، تو اس کو دفع کرنے کے لیے وہ جذبہ مشتعل ہوتا ہے جس کا نام نیشنلزم ہے۔

اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر ہندوستان کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کیا فی الواقع یہاں نیشنلزم کی اساس موجود ہے؟ بلاشبہ سیاسی قومیت یہاں ضرور پائی جاتی ہے، کیونکہ یہاں کے باشندے ایک سیاسی نظام کے تابع ہیں، ایک قسم کے قوانین انکی تمدنی و معاشی زندگی پر حکمراں ہیں، اور ایک فولادی ڈھانچہ ان سب کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں محض سیاسی قومیت، قوم پرستی پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ قومیت آسٹریا ہنگری، برطانیہ و آئرلینڈ، سلطنت روس، سلطنت عثمانیہ، چیکوسلواکیا، یوگوسلیویا اور بہت سی دوسری سلطنتوں میں بھی پائی جاتی تھی، اور اب بھی بکثرت ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر کہیں بھی اس نے نیشنلزم پیدا نہیں کیا۔ آزادی کے جذبہ میں مشترک ہونا، یا مصائب اور خطرات میں مشترک ہونا

بھی نیشنلزم کی پیدائش کے لیے ناکافی ہے۔ یہ چیز اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف تہذیبی قومیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، اور ہر وہ شخص جو آنکھیں رکھتا ہے، اس حقیقت کو دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں تہذیبی قومیت موجود نہیں ہے۔

پھر جب امر واقعی یہ ہے تو یہاں نیشنلزم کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جہاں سرے سے ماں ہی موجود نہیں ہے وہاں بچے کا ذکر کرنا ظاہر ہے کہ نادانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس ملک میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا خیال ظاہر کرتے ہیں انہیں جاننا چاہیے کہ یہ بچہ تہذیبی قومیت ہی کے بطن سے پیدا ہو سکتا ہے، اور اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کی ماں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو جب وہ اچھی طرح جان لینگے تو انہیں اپنے دعوے میں ترمیم کرنی پڑیگی۔ قبل اسکے کہ وہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا نام لیں، انہیں یہ کہنا پڑیگا کہ یہاں ہم ایک تہذیبی قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوستانی نیشنلزم فروغ پا سکے۔

اچھا اب اس سوال پر غور کیجیے کہ یہاں ایک تہذیبی قومیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے امکانی نتائج کیا ہونگے؟

جس ملک میں مختلف تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہوں، وہاں ایک قومیت کی پیدائش دو ہی صورتوں سے ممکن ہے۔

(۱) ایک قوم کی تہذیب باقی سب قوموں کو فتح کرلے۔

(۲) سب کے اختلاط و امتزاج سے ایک مشترک تہذیب پیدا ہو جائے۔

پہلی صورت یہاں خارج از بحث ہے کیونکہ ہندوستانی نیشنلزم کے حامی اس کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ یہ چیز اگر نصب العین بن سکتی ہے تو ہندو نیشنلزم یا "مسلم نیشنلزم" کے حامیوں کی بن سکتی ہے۔ رہے ہندوستانی نیشنلسٹ تو ان کے درمیان اتفاق صرف دوسری صورت

ہی پر ہو سکتا ہے، چنانچہ ان کے حلقوں میں اکثر اس مسئلہ پر بحث بھی ہوتی ہے کہ اس ملک کی مختلف قوموں کے امتزاج سے کسی طرح ایک قومیت پیدا کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ ایسی طفلانہ باتیں کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تہذیبی قومیت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، نہ انہیں یہ خبر ہے کہ اس قسم کی قومیتوں کا امتزاج کس طرح کن قوانین کے تحت ہوتا ہے، اور نہ انہوں نے کبھی اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ایسے امتزاج سے کس شان کی قومیت بنتی ہے۔ وہ اسے بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور بچوں ہی کی طرح اس کھیل کو کھیلنا چاہتے ہیں۔

تہذیبی قومیت دراصل نام ہے ایک قوم کے مزاج عقلی اور نظام اخلاقی کا۔ اور یہ چیز مصنوعی طور پر ایک دو دن میں نہیں بن جاتی، بلکہ صدیوں میں اس کا نشو و نما فطری تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ صدہا برس تک جب کچھ لوگ نسلاً بعد نسلٍ ایک قسم کے عقائد اور رسوم و عادات کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، تب کہیں جا کر ان میں ایک مشترک روح پیدا ہوتی ہے، مشترک اخلاقی اوصاف مستحکم ہوتے ہیں، ایک مخصوص مزاج عقلی بنتا ہے، وہ روایات جڑ پکڑتی ہیں جن سے ان کے جذبات و حسیات (Sentiments) وابستہ ہوتے ہیں، وہ لٹریچر پیدا ہوتا ہے جو ان کے دل و دماغ کا ترجمان ہوتا ہے، اور وہ ذہنی و روحانی یک رنگی رونما ہوتی ہے جس سے ان میں باہمی اُنس اور تفاہُم (Mutual intelligibility) پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب اِن گہرے اور مضبوط اثرات کے تحت کسی گروہ کی مستقل قومیت بن جاتی ہے، یا دوسرے الفاظ میں جب اس کا اخلاقی اور عقلی مزاج مستحکم ہو جاتا ہے تو اس کے لیے کسی دوسرے گروہ کے ساتھ خلط ملط ہو کر کسی دوسری قومیت میں تبدیل ہو جانا تقریباً محال ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسی گروہ سینکڑوں برس تک ایک ہی آب و ہوا اور ایک ہی سرزمین میں پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، مگر کسی قسم کا امتزاج واقع نہیں ہوتا۔ یورپ میں جرمن، مگیار، پول، چیک، یہودی، سلافی اور

ایسی ہی دوسری قومیں مدتوں سے ایک جگہ زندگی بسر کر رہی ہیں مگر آج تک ان کے درمیان امتزاج پیدا نہیں ہوا۔ انگریز اور آئرش صدیوں تک ساتھ رہے مگر کسی طرح مل کر ایک نہ ہو سکے۔ کہیں کہیں ایسے گروہوں کی زبانیں بھی مشترک ہوتی ہیں، مگر زبان کے اشتراک سے دل و دماغ کا اشتراک رونما نہیں ہوتا۔ الفاظ مشترک ہوتے ہیں، مگر وہ ہر قوم کے دل میں جو جذبات و خیالات پیدا کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

یک جا بود و باش اور طویل مدت تک باہمی اختلاط سے مختلف تہذیبی گروہوں کا مل کر ایک صحیح قسم کی مکمل اور متحد قومیت پیدا کرنا صرف اس صورت میں ممکن ہے، اور صرف اسی صورت میں وہ اعلیٰ درجہ کے تمدنی نتائج پیدا کر سکتا ہے، جبکہ ایسے گروہوں کے نظام اخلاق اور مزاج عقلی میں کوئی بڑا اور اہم تفاوت نہ ہو، بلکہ وہ بڑی حد تک متشابہ الاخلاق ہوں۔ اس صورت میں انکی الگ الگ اخلاقی خصوصیات اور انکے جداگانہ قومی تشخصات مٹ جاتے ہیں اور ایک متحد نظام اخلاق بن جاتا ہے۔ مگر یہ عمل بھی اس طرح نہیں ہوتا جیسے ہتیلی پر سرسوں جمائی جائے، بلکہ مدتہائے دراز تک کسر و انکسار ہوتا رہتا ہے تب کہیں مختلف اجزاء ریں گھل مل کر ایک مزاج پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان میں برائٹن، سیکسن اور نارمنڈی قوموں نے ایک قوم بنتے بنتے سینکڑوں برس لیے ہیں۔ فرانس میں دس صدیوں سے یہ عمل جاری ہے اور اب تک قومیت کا خمیر پوری طرح تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اٹلی میں اس وقت تک کوئی مشترک قومی روح پیدا نہیں ہو سکی ہے، حالانکہ وہ مختلف عناصر جن سے اطالوی قومیت کی ترکیب ہوئی ہے اخلاقی حیثیت سے باہم کوئی بین تفاوت نہیں رکھتے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ایک قومیت صرف اُن عناصر کے امتزاج سے بن سکی ہے جو بہت کچھ متشابہ الاخلاق تھے اور جن کو مشترک اغراض نے مجبور کر دیا تھا کہ اپنے خفیف سے اختلاف و تفاوت کو جلدی سے دفن کر کے یک جان ہو جائیں۔ تاہم اس عمل نے بھی

پایۂ تکمیل کو پہنچتے پہنچتے ڈھائی تین سو برس لیے ہیں۔

متشابہ الاخلاق قوموں کے امتزاج سے ایک صحیح اور عمدہ قسم کی قومیت بننا صرف اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ انہیں اس عملِ امتزاج کے دوران میں اپنے عقائد و نظریات اور اپنے اخلاقی معیاروں کو طلاق دینے اور اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اوصاف کو جڑ سے اکھاڑنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ یہ چیزیں انکے درمیان پہلے ہی سے مشترک ہوتی ہیں۔ صرف روایات کے رد و بدل اور جذبات وحسیات اور مقاصد و اغراض کی جدید تنصیب (Readjustment) سے ہی انکی نئی قومیت بن جاتی ہے۔ بخلاف اسکے جہاں مختلف الاخلاق قوموں میں کسی مصنوعی دباؤ، کسی جعلی کوشش اور بعض ادنیٰ درجہ کے محرکات سے امتزاج واقع ہوتا ہے وہاں ایک نہایت ذلیل قسم کی قومیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے عقائد کی جڑیں ہل جاتی ہیں، ان کے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی خصائص (جو ان کے امتیازی اوصاف تھے۔ اور جنکی موجودگی میں امتزاج ممکن نہ تھا) مٹ جاتے ہیں، ان کے حسیاتِ ملّی (جن پر انکی قومیت کی اساس قائم تھی) فنا ہوجاتے ہیں، ان میں سے ہر قوم کو اپنے اپنے معیاراتِ فضل و شرف بدلنے پڑتے ہیں، اور اُن کی نئی قومیت اُن میں سے ہر ایک کے رذائلِ اخلاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس نوعیت کا امتزاج قوموں کے نظامِ اخلاق کو درہم برہم کردیتا ہے اور نیا نظامِ اخلاق بننے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اپنی اپنی سابق روایات سے اُن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور نئی روایات بننے میں بہت دیر لگتی ہے۔ اپنے اپنے نیشنل ٹائپ کو وہ خود مسمار کردیتے ہیں اور نیا ٹائپ ڈھلنے کے لیے بڑا وقت لیتا ہے۔ اس خطرناک حالت میں جو لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی نہیں ہوتی۔ وہ دنی الاخلاق، کم ظرف، تنگ حوصلہ، چھچھورے، متلون، اور بے اصولے ہوتے ہیں۔ انکی حالت اس پتے کی سی ہوتی ہے جو درخت سے

ٹوٹ کر میدان میں جا پڑا ہو اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اڑتا پھرتا ہو، کہیں اسکو قرار نہ ہو۔ برازیل (جنوبی امریکہ) میں مختلف الاخلاق قوموں کے اختلاط و امتزاج کا حال جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بلا تمام اُن قوموں کے محاسن کو یکساں طور پر برباد کر رہی ہے جو اسکے زیر اثر آگئی ہیں، اور اسکی بدولت وہاں عقلی، اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے نہایت گھٹیا درجہ کی نسل پیدا ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں جو تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہیں انہیں کوئی ایسا شخص متشابہ الاخلاق نہیں کہہ سکتا جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، اور جو سیاسی خواہشات سے قطع نظر کرکے محض حقائق نفس الامری کی بنا پر رائے قائم کرتا ہو۔ ان قوموں کے درمیان اُس سے زیادہ گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں جتنے یورپ کی مختلف تہذیبی قومیتوں کے درمیان موجود ہیں۔ یہاں عقائد میں بعد المشرقین ہے۔ اصول تہذیب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نظام اخلاق میں بین تفاوت ہے۔ روایات کے سرچشمے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ جذبات و حسیات باہم متناقض ہیں۔ اور ہر ایک کا نیشنل ٹائپ اپنے خط و خال میں دوسرے کے نیشنل ٹائپ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ یہاں محض سیاسی و معاشی اغراض کی خاطر ان مختلف قومیتوں کو مٹا کر ایک ممزوج و مخلوط قومیت پیدا کرنے کی کوشش لامحالہ وہی نتیجہ پیدا کریگی جسکی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ بدقسمتی سے ڈیڑھ دو سو سال کے انگریزی اقتدار نے ان قوموں کو پہلے ہی اخلاقی انحطاط میں مبتلا کر دیا ہے۔ غلامی کا گھن ان کے جوہر شرافت کو پہلے ہی کھا چکا ہے۔ انکی سیرتیں کمزور ہو چکی ہیں۔ ان کے عقائد جڑوں سے ہل چکے ہیں۔ ان کا تعلق اپنی روایات سے بہت کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ ان کے نیشنل ٹائپ مضمحل ہو گئے ہیں۔ ان کا معیار اخلاق پست ہو گیا ہے۔ ان کے اخلاقی خصائص میں استحکام باقی نہیں

رہا ہے۔ اور نئی نسلوں میں اس تنزل و انحطاط کے نہایت مکروہ نتائج دیکھے جا رہے ہیں۔
اس حالت میں قوم سازی کا عمل جاری کرنے کے لیے جب انکی رہی سہی تہذیبی بنیادوں پر ضرب لگائی جائیگی تو یقین رکھیے کہ پورے ملک کا نظام اخلاق درہم برہم ہو جائیگا، اور اس کے نتائج نہایت ہولناک ہونگے۔

وہ محض طفلانہ خام خیالی ہے جبکی بنا پر ہمارے ملک کے سیاسی لیڈر بغیر سوچے سمجھے رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اجنبی طاقت کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں نیشنلزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور نیشنلزم پیدا کرنے کے لیے ایک قومیت بنانے کی حاجت ہے' لہذا تمام موجودہ قومیتوں کو مٹا دو، اور سب کی ایک قومیت بنا ڈالو۔ حالانکہ اگر ان لوگوں میں صحیح بصیرت موجود ہو اور یہ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر خود سوچنے سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ ہندوستان کی نجات کا نہیں، اُسکی تباہی کا ہے۔

اولاً اس راستہ سے آزادی حاصل کرنا درحقیقت نہایت دیر طلب کام ہے۔ سینکڑوں ہزاروں برس کی روایات پر جو تہذیبی قومیتیں قائم ہیں ان کا مٹنا، انکی جگہ ایک نئی قومیت کا وجود میں آنا، اور پھر اس قومیت کا مستحکم اور مشتعل ہو کر نیشنلزم کی حد تک پہنچنا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہرحال ایک طویل مدت درکار ہے، اور اگر آزادی کا حصول اسی پر موقوف ہے تو ہندوستان کو کم از کم ابھی دو تین نسلوں تک اس کا انتظار کرنا پڑیگا۔

ثانیاً اگر اس راستہ سے آزادی حاصل ہو بھی جائے تو جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اس میں یہ خطرہ ہے کہ آخرکار تمام ملک اخلاقی انحطاط کے هاویہ میں گر جائیگا۔

ثالثاً یہ ایک یقینی امر ہے کہ جن قوموں کو اپنی انفرادیت سے کچھ بھی لگاؤ باقی ہے وہ اس نوعیت کی قوم سازی کے خلاف پوری جدوجہد کرینگی، اور اس کشمکش میں آزادی وطن کے لیے کوئی

متحدہ کوشش نہ کی جا سکیگی۔ لہٰذا اجنبی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاید یہ دور کا راستہ بھی نہیں ہے بلکہ قریب کا راستہ ہو۔ اگر اس راستہ کو اختیار کرنے پر یونہی اصرار کیا جاتا رہا تو کچھ بعید نہیں کہ سیاسی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہ سکے۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک وہ لوگ سخت نادان ہیں جو محض مغربی قوموں کی تقلید میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ملکی آزادی کے لیے بس نیشنلزم ہی ایک کارگر آلہ ہے۔ میں پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی اور سیاسی و معاشی ترقی کے لیے سرے سے قومی وحدت اور نیشنلزم کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جہاں مختلف تہذیبی قومیتیں موجود ہوں وہاں قومی وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے، نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے، بلکہ نتائج کے اعتبار سے بھی مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ہے۔ ایسی جگہ وحدت نہیں بلکہ صرف وفاق کے اصول (Federal principles) ہی چل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے، ہر ایک کو اپنے قومی معاملات میں آزاد و خود مختار قرار دیا جائے، اور صرف مشترک وطنی اغراض کی حد تک تمام قوموں کے درمیان اتفاق عمل (joint action) کا معاہدہ ہو جائے۔ بس یہی ایک صورت ہے جس سے ملک کی تمام جماعتوں میں اپنی انفرادیت کے بقاء و تحفظ کا اطمینان پیدا ہو سکتا ہے، اور یہی چیز ملک کی تمام قوتوں کو سیاسی ترقی کی جدوجہد میں ایک محاذ جنگ پر مجتمع کر سکتی ہے۔

فرنگی لباس استفسار کے پہلے حصہ نے اتنا زیادہ وقت لے لیا کہ اب دوسرے حصہ پر بحث کرنے کے لیے نہ زیادہ وقت باقی ہے نہ گنجائش۔ تاہم مختصر الفاظ میں یہاں چند اشارات کیے جاتے ہیں۔

یہ قوم پرست بھی کچھ عجیب قسم کی مخلوق ہیں۔ ایک طرف یہ بڑے زور شور کے ساتھ قوم پرستی

کا پرچار کرتے ہیں۔ دوسری طرف انہیں غیر قوم اور غیر ملک کا لباس و تمدن اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ اور اس پر بھی بس نہیں۔ یہ اُس اجنبی لباس و تمدن کو اپنی قوم میں رواج دینے کی اِس طرح کوشش کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی قوم پرستی کے پروگرام کا کوئی حصہ ہے، حتی کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ زبردستی اُس کو لوگوں کے سر منڈھنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہندوستان، ایران، مصر، ٹرکی، ہر جگہ ان حضرات کی یہی روش ہے۔ حالانکہ قوم پرستی ــــ اگر اس لفظ کے مفہوم میں قومی حمیت و غیرت کا بھی کچھ حصہ ہو ــــ اس بات کی فطری طور پر متقاضی ہے کہ آدمی خود اپنی قوم کے لباس اور طرز تمدن پر قائم رہے، اسی میں عزت اور شرف محسوس کرے، اور اسی پر فخر کرنا سیکھے۔ جہاں سرے سے یہ چیز بالکل ہی مفقود ہے وہاں قوم پرستی خدا جانے کہاں سے آجاتی ہے۔ غیرتِ قومی کا فقدان اور قوم پرستی، دونوں صریح طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ہمارے قوم پرست دوست اضداد کو جمع کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خیالات اور اعمال میں تناقض سے محفوظ رہنے کے لیے ذہن سلیم اور نظر سدید درکار ہے، اور یہ چیز اگر حاصل ہو تو آدمی فطرت کی سیدھی صاف راہ چھوڑ کر قوم پرستی ہی کیوں اختیار کرے۔

اسلام اس معاملہ میں بھی ان حضرات کا ساتھ دینے سے انکار کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں سیدھا، صاف، معقول اور فطری راستہ جو ہو سکتا ہے اُسی کا نام اسلام ہے، اور وہ جس طرح قومیت کے مبالغہ اور اسکی افراط (یعنی قوم پرستی) کا ساتھ نہیں دیتا اسی طرح کسی ایسی چیز کا بھی ساتھ نہیں دیتا جو قومیت کی جائز فطری حدبندیوں کو توڑنے والی، اور قوموں کی انفرادیت یا ان کے امتیازی خصائص کو مٹانے والی، اور انکے اندر رذائل اخلاق پیدا کرنے والی ہو۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اگرچہ سب ایک ہی اصل سے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان دو قسم کے امتیاز رکھے ہیں۔ ایک عورت اور مرد کا امتیاز۔ دوسرا نسب اور قبیلہ اور قومیت

کا امتیاز۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا[1] (الحجرات - ۲)
وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى[2] (النجم - ۳)۔ یہ دونوں قسم کے امتیازات انسانی تمدن اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہیں اور فطرت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو صحیح حدود کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ عورت اور مرد کا امتیاز اس لیے ہے کہ ان کے درمیان نفسیاتی کشش ہو، لہٰذا ضروری ہوا کہ تمدن و معاشرت میں دونوں کے اوصاف امتیازی پوری طرح محفوظ رکھے جائیں۔ اور قوموں کا امتیاز اس لیے ہے کہ تمدنی اغراض کے لیے انسانوں کے ایسے اجتماعی دائرے اور حلقے بن سکیں جن کے درمیان آسانی کے ساتھ باہمی تعاون ہو سکے، لہٰذا ضروری ہوا کہ ہر گروہ یا ہر تمدنی و اجتماعی حلقے کے کچھ امتیازی اوصاف ہوں جن کے ذریعہ سے ایک حلقہ کے آدمی آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکیں، باہم مانوس ہوں، ایک دوسرے کو سمجھ سکیں، اور دوسرے حلقوں کے آدمیوں میں فرق کر سکیں۔ اس قسم کے امتیازی اوصاف ظاہر ہے کہ زبان، لباس، طرز زندگی، اور شانِ تمدن ہی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔

اسی بنا پر اسلام میں تشبہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے اور اس مرد پر جو عورت کا سا لباس پہنے[3]۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے ملعون قرار دیا ان مردوں کو جو عورتوں کے مشابہ بنیں اور ان عورتوں کو جو مردوں کے مشابہ بنیں[4]۔ یہ اس لیے کہ عورت اور مرد کے درمیان جو نفسیاتی کشش اللہ نے رکھی ہے، یہ تشبہ اس کو دباتا اور گھٹاتا ہے، اور اسلام اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح قوموں کے لباس و تمدن اور شعائر کو بھی مٹانا اور انہیں خلط ملط کرنا اجتماعی مفاد و مصالح کے

[1] لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

[2] اور اللہ نے مرد اور عورت کی دو صنفیں پیدا کیں۔ [3] المستدرک جلد ۴۔ صفحہ ۱۹۴۔ [4] بخاری کتاب اللباس

خلاف ہے، لہٰذا اسلام اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ قومی امتیاز کو جب فطری حدود سے بڑھا کر قوم پرستی بنایا جائیگا تو اسلام اس کے خلاف جہاد کریگا، کیونکہ اس مادہ سے جاہلانہ حمیت، ظالمانہ تعصب، اور قیصریت کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کی دشمنی قوم پرستی سے ہے نہ کہ قومیت سے۔ قوم پرستی کے برعکس قومیت کو وہ برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اسے مٹانے کا بھی وہ ویسا ہی مخالف ہے جیساکہ اس کو حد سے بڑھانے کا مخالف ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو متوسط اور متوازن رویہ اسلام نے اختیار کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل آثار کو بغور ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ایک صحابی نے پوچھا کہ عصبیت کیا چیز ہے؟ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں۔ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے (ابن ماجہ)

(۲) فرمایا جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کریگا وہ اسی قوم میں شمار ہوگا (ابو داؤد)

(۳) حضرت عمرؓ نے آذربیجان کے گورنر عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ خبردار، اہل شرک (یعنی باشندگان آذربیجان) کے لباس اختیار نہ کرنا۔ (مسلم۔ کتاب اللباس والزینہ)

(۴) حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو عام احکام دیے تھے کہ غیر مسلم باشندوں کو اہل عرب کے سے لباس اور وضع و ہیئت اختیار کرنے سے روکیں۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں سے صلح کرتے وقت باقاعدہ معاہدہ میں ایک مستقل دفعہ اس مضمون کی شامل کردی گئی تھی کہ تم ہمارے جیسے لباس نہ پہننا (کتاب الخراج امام ابو یوسف)

(۵) جو اہل عرب فوجی یا ملکی خدمات کے سلسلہ میں عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مامور تھے انکو حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بار بار تاکید کرتے تھے کہ اپنی زبان اور لہجہ کی حفاظت کریں اور عجمی بولیاں نہ بولنے لگیں (بیہقی)

ان روایات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہو کہ اسلام جس بین الاقوامیت کا علمبردار ہے اُس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ قوموں کی امتیازی خصوصیات کو مٹا کر انہیں خلط ملط کر دیا جائے، بلکہ وہ قوموں کو انکی قومیت اور خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھکر اُنکے درمیان تہذیب و اخلاق اور عقائد و افکار کا ایک ایسا رشتہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے بین الاقوامی کشیدگیاں، لڑائیاں، ظلم اور تعصبات دور ہو جائیں اور انکے درمیان تعاون و برادری کے تعلقات قائم ہوں۔

تشبہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسکی بنا پر اسلام اسکا سخت مخالف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے لوگ اپنی قومی خصوصیات کو صرف اسی وقت چھوڑتے ہیں جب انکے اندر کوئی نفسی کمزوری اور اخلاقی ڈھیل پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور انکے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اسکے اندر تلون، بے جوہرپن، بے عزتی، انفعال اور خفیف الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔ اگر اسکی روک تھام نہ کی جائیگی تو یہ مرض ترقی کریگا۔ اگر بکثرت لوگوں میں یہ پھیل گیا تو ساری قوم نفسیاتی ضعف میں مبتلا ہو جائیگی۔ اسکے اخلاق میں کوئی پختگی باقی نہ رہیگی۔ اس کے ذہن کی چولیں اتنی ڈھیلی ہو جائینگی کہ ان پر اخلاق اور خصائل کی مستحکم بنیادیں قائم ہی نہ ہو سکینگی۔ لہٰذا اسلام کسی قوم کو بھی یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اپنے اندر اس نفسی بیماری کو پرورش کرے۔ یہ مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ جہاں اسکا بس چلتا ہے، وہ غیر مسلموں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ کسی انسان میں بھی اخلاقی کمزوری دیکھنا نہیں چاہتا۔

خصوصیت کے ساتھ مفتوح و مغلوب لوگوں میں یہ مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ انکے اندر محض اخلاقی ضعف ہی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خود حقیر سمجھتے ہیں، اور اپنے حکمرانوں کی نقل اتار کر عزت اور فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ عزت، شرافت، بزرگی، تہذیب، شائستگی، غرض جس چیز کا بھی وہ تصور کرتے ہیں اُسکا مثالی نمونہ انہیں اپنے آقاؤں ہی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ غلامی انکے جوہر آدمیت کو اس طرح کھا جاتی ہے کہ وہ علانیہ اپنی ذلت اور پستی کا مجسم اشتہار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس میں شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں[۱]۔ اسلام جو انسان کو پستیوں سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جانے آیا ہے،

[۱] ہمارے اس بیان کی صداقت میں اگر کسی صاحب کو شک ہو تو وہ ہندوستان (۷۹) ہی میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فرق کو دیکھ لیں۔ مٹھی بھر انگریز متفرق و پراگندہ، دو ڈھائی سو برس سے کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان رہتے ہیں مگر ایک انگریز بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس نے [illegible]

ایک لمحہ کے لیے بھی اسکو جائز نہیں رکھتا کہ کوئی انسانی گروہ احتقارِ نفس کے اس اسفل السافلین میں گر جائے جس سے نیچے پستی کا کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عجمی قومیں اسلامی حکومت کے زیرنگیں آئیں تو آپ نے انکو سختی کیساتھ اہلِ عرب کی نقالی سے روکا۔ اسلامی جہاد کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اگر ان قوموں میں غلامانہ خصائل پیدا ہونے دیے جاتے۔ رسول اللہ نے عربوں کو اسلام کا پرچم اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ قوموں کے آقا بنیں اور قومیں انکے ماتحت غلامی کی مشق بہم پہنچائیں۔

ان وجوہ سے اسلام اس بات کا مخالف ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم کا ہو بہو چربہ بننے کی کوشش کرے اور اس کے لباس و طرزِ معاشرت کی نقالی کرنے لگے۔ رہا تہذیب و تمدن کا وہ لین دین جو ایک دوسرے سے میل جول رکھنے والی قوموں میں فطری طور پر واقع ہوتا رہتا ہے، تو اسلام اسکو نہ صرف جائز رکھتا ہے بلکہ فروغ دینا چاہتا ہے۔ وہ قوموں کے درمیان تعصبات کی ایسی دیواریں کھڑی کرنا نہیں چاہتا کہ اپنے تمدن میں ایک دوسرے کی کوئی چیز سرے سے لیں ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شامی جبہ پہنا ہے جو یہودیوں کے لباس کا جزو تھا، چنانچہ حدیث میں ہے فتوضأ وعليه جبة شامية۔ آپ نے تنگ آستینوں والا رومی جبہ بھی پہنا ہے جسے رومن کیتھولک عیسائی پہنتے تھے۔ نوشیروانی قبا بھی آپ کے استعمال میں رہی ہے جسے حدیث میں جبة طيالسة كسروانية کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے برنس پہنی ہے جو ایک قسم کی اونچی ٹوپی ہوتی تھی اور عیسائی درویشوں کے لباس کا جزو تھی۔ اس قسم کی متفرق چیزوں کا استعمال تشبہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تشبہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری وضع قطع کسی دوسری قوم کے مانند ہو اور اس کو دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے جسے ہم "لین دین" کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کوئی اچھی یا مناسبِ حال چیز لے کر اُسے اپنی وضع قطع کا جزو بنا لے اور اس جزو کے شامل ہونے پر بھی اُسکی قومی وضع بحیثیت مجموعی قائم رہے۔

یہ مختصر اشارات دفع شبہات کے لیے کافی ہیں۔ اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر میں نے ایک مستقل مضمون اب سے دس سال پہلے رسالہ "معارف" میں لکھا تھا۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں وہ یہاں نقل کر دیا جائیگا تاکہ تمام گوشے ناظرین کے سامنے آجائیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹ ۔ پھرتے ہیں اور لباس ہی میں نہیں بلکہ (۸۰) اپنی بول چال، انداز و اطوار، حرکات و سکنات ہر چیز میں انگریز کا پورا چربہ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائیگی؟

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-